Edited

انوار دانش

از

محمود اسرائیلی

پبلشر

علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

نمبر ۳۷۳ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

قیمت :- دو روپیہ

پرنٹر:- یوسف بھائی ایم بھاتری
علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ
مالکان مطبع محمدی گنپاؤڈر روڈ مجگاؤں بمبئی

زیست نتیجۂ عمل اور عمل حاصلِ خیال

پست ہے زندگی اگر عزم میں برتری نہیں

فہرست

تقریب

از حضرت علامہ قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی

ملکۂ شاعری ایک فطری اور وہبی عطیہ ہے جو ہر شخص کو عطا نہیں ہوتا۔ یوں کہنے کو سیکڑوں شاعر ہیں لیکن ان میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو صرف ناظم کہے جا سکتے ہیں۔ اکتسابی طور پر فن شعر میں مشق و مہارت بہم پہونچا کر مروجہ طرز میں شعر کہنا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن کلام میں ایک خاص اثر پیدا کرنا ایک سچے شاعر ہی کا حصہ ہے شاعر کی نظر اس قدر وسیع ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے وہ عام آدمیوں کو نظر نہیں آتا نہ محسوس ہوتا ہے، وہ جس گہرائی تک پہنچتا ہے دوسرا اسکی گرد کو نہیں پا سکتا۔ گجراتی زبان کی مشہور مثل ہے "جہاں نہ پہونچے روی تیاں پہونچے کوی" یعنی جس بلندی پر مشتری نام کا سیارہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں شاعر کی رسائی ہوتی ہے۔ فن کار ہونا اور چیز ہے اور فطری استعداد و صلاحیت دوسری چیز۔ لیکن اس فطری ملکۂ راسخ کے ساتھ طبع رسا اور تحصیل علوم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ فارسی کا مشہور شاعر انوری کہتا ہے ؎

شاعری را سہ چیز می باید | تاکہ اشعار بر مراد آید
طبع و تحصیل و فیض یزدانی | ہر کرا نیست زاژ میسناید

اسی قسم کے شعراء میں سے جو علم و فضل کے ساتھ طبع رسا بھی رکھتے ہیں میرے محترم دوست حضرت محمود اسرائیلی ہیں جو اردو کے ایک نغز گو شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اپنی بلند نظرت اور پاکیزہ طبیعت کی مناسبت سے وہ شاعری میں بھی بلند خیال واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں اور شعراء نے حسن و عشق مجازی کے پیچھے اپنی استعداد اور صلاحیتیں قربان کر دی ہیں، وہاں حضرت محمود نے اپنی شاعری کا موضوع ملک و ملت اور اخلاق و حکمت کو بنایا ہے اور وقتاً فوقتاً ان کا قلم ان موضوعات سخن میں موتی رولتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کا کلام

"ان من الشعر لحکمۃ" کا پورا مصداق ہے چنانچہ زیر نظر مجموعۂ کلام منظومات جو ان کے "انوار دانش" کا ایک روشن ترین نمونہ ہے، اس امر کا شاہد عادل ہے۔

حضرت محمود ایک کہنہ مشق سخنور ہیں اور انکی متعدد نظمیں ملک کے اکثر اخبارات و رسائل میں شایع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "خیاباں" کے نام سے شایع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اب انھوں نے اپنا کلیات تین علیحدہ حصوں میں چھپوانے کا تہیہ کر لیا ہے جن میں سے ایک حصہ "انوار دانش" کے نام سے حکیمانہ اور اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے جن پر سطور ذیل میں تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

"انوار دانش" کی اکثر نظمیں شایع ہو چکی ہیں۔ لطف سخن اور قبول خاطر خداداد باتیں ہیں اور ان دونوں میں حضرت محمود پوری طرح کامیاب ہیں۔

ان منظومات کی فنی حیثیت کی نسبت کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے اس لئے کہ فن شعر میں حضرت محمود کی مہارت اور دسترس مسلّمہ ہے۔ ان کی نظم کی ٹیکنک (Technique) مخصوص ہے جو ان کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے دیکھنے کی چیز خیالات ہیں جو نہایت خوش اسلوبی سے لطیف و رنگین پیرایہ بیان کے ساتھ سلک نظم میں پروئے گئے ہیں گہرے سے گہرے معانی اور مطالب کو ایک شاعرانہ پیرایہ بیان اور نادر تشبیہات و استعارات میں ادا کرنا حضرت محمود کا خاص حصہ ہے اور یہ خصوصیت ان کی ہر نظم سے نمایاں ہے۔ اپنے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کے ساتھ وہ آخر میں ایسا عمدہ حکیمانہ اور اخلاقی نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ جو صرف ایک فلسفی شاعر ہی کے بس کی بات ہے مثالاً ملاحظہ ہوں ان کی نظمیں "درس بصیرت" "عالم ما فی العالم" "حدیث غنچہ" "فلسفہ حیات و ممات" "راز بقا" وغیرہ۔ ان کا مطالعۂ فطرت کس قدر عمیق ہے اور ان نتائج پر پہونچنے میں وہ مظاہر فطرت سے کس طرح کام لیتے ہیں وہ ان کے اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے ؎

میں قدرت کے لب خاموش سے اسرار سُن سُن کر
گل و بلبل سے حسن و عشق کی گفتار سُن سُن کر
زبانِ شمع سے فریاد آتش بار سُن سُن کر
حدیث دہر کی اشعار میں تفسیر کرتا ہوں

حضرت محمود نے زندگی کے بہت سی نشیب و فراز دیکھے ہیں اور وسیع تجربات حاصل کیے ہیں انھوں نے ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی ہے اخبار نویسی اور درس و تدریس کے ساتھ عالم اسلامی کی سیاست پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو اپنی قوم کی حالت زار کا پورا احساس ہے اور وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں یہ درد و احساس بین السطور جھلک رہا ہے ملاحظہ ہوں ان کی نظمیں :-

("ہسپانیہ کا اجڑا ہوا باغ" "شکوہ شمع" "مسلک تسلیم" "راز ہستی" "دنیائے عمل" وغیرہ) اس لئے ان کی منظومات کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ع درای شاعری چیزے دگر ہست

لیکن قومی یا اسلامی رنگ میں جو کچھ وہ کہتے ہیں اشارۃً و کنایۃً کہتے ہیں یا پھر طنزاً۔ اقبال کی طرح کھل کر یا ظفر علی خاں کی طرح بیباکانہ نہیں کہتے گو بظاہر طرز ادا میں وہ ان دونوں سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔

حضرت محمود انگریزی شاعری پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے انگریزی شاعری کا ان کے کلام پر اثر پڑا ہے۔ ان کی بہترین نظم "عالم وما فی العالم" کو پڑھتے وقت شیلے کی مشہور نظم "عشق" پیش نظر ہو جاتی ہے (جس کا ترجمہ وہ ایک دوسری نظم میں "فلسفۂ محبت" کے نام سے کر چکے ہیں) لیکن موخرالذکر نظم میں وہ گہرائی نہیں ہے جو حضرت محمود کی نظم میں پائی جاتی ہے گو موضوع کے لحاظ سے دونوں نے ذرات کی کشش اور اتصال کے موضوع پر یکساں نظر ڈالی ہے۔

حضرت محمود کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری پر شبلی اور اقبال کا خاص اثر ہے خصوصاً موخرالذکر بزرگوار کے طرز ادا اور انداز بیان سے ان کا طرز کلام بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ خوبصورت فارسی ترکیبوں، فارسی محاوروں اور اسلوب نگارش میں اس قدر ہم آہنگی ہے کہ دونوں کے کلام میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

ایک خاص وصف جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ حضرت محمود کی وسعت نظر ہے جو نتیجہ ہے ان کے مختلف تجربات زندگی کا جو اس کے مختلف شعبوں میں انھوں نے حاصل کیے ہیں اور یہ الفاظ کی بندش، تراکیب کی چستی، قافیوں کی شگفتگی اور ترنم بحور و اوزان کے ساتھ مل کر ان کے

حسن کلام اور اس کی قدر و قیمت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ انھوں نے اظہار جذبات کا وہی شاعرانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو فارسی شاعری میں عام ہے یعنی کہ ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

شاعرانہ بول چال میں مقررہ استعارات و تشبیہات کے ساتھ ادائے مطالب میں حضرت محمودؔ کو کمال حاصل ہے۔ کچھ باتیں اسقدر نازک ہوتی ہیں جو الفاظ کی متحمّل نہیں ہوتیں انکو صرف استعارات و کنایات ہی میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ باوجود فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت کے انکے کلام میں کہیں ثقل نہیں پیدا ہوتا اور نہ اسکے پڑھنے میں کوئی بے لطفی محسوس ہوتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر فارسی کی خوبصورت ترکیبوں کو کھپایا ہے جو فارسی شاعری میں عام طور پر مستعمل ہیں اور تشبیہات و استعارات بھی نامانوس یا دور از کار نہیں معلوم ہوتیں۔

بایں ہمہ اوصاف حضرت محمودؔ ترقی پسند شعراء کے ہمنوا اور ہم آہنگ نہیں بنتے بلکہ اس نام نہاد ہنگامۂ اشتراکی اور شورش انقلابی سے وہ ذرہ بھر متاثر نہیں ہوئے ان کا نصب العین ٹھیٹھ اسلامی یا یوں کہئے کہ محض انسانی ہے، جس سے وہ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بننے اور سرگرم عمل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کی نظمیں ''رازِ مسرت'' ''حدیث غنچہ'' وغیرہ

اس مجموعہ کی نظمیں بہت طویل تو نہیں لیکن ان میں سے نمونہ کلام پیش کرنا تطویل کا باعث ہے اسلئے ہم نے صرف نظموں کے عنوانات کا حوالہ دے دیا ہے۔ یوں تو انکی ہر نظم ان کے جذبات و تاثرات کا مرقع اور انکی قدرت کلام کا نمونہ ہے لیکن خاص طور پر ان کی یہ نظمیں قابل ذکر ہیں ''رازِ زیستی'' ''درس حقیقت'' ''شاعر'' ''عالم وما فی العالم'' جو بلحاظ تاثر اور حسن بیان کے شاہکار کہی جاسکتی ہیں خود انھوں نے بھی بالکل صحیح فرمایا ہے ؎

میری فغان کا طور نرالا جہاں سے ہے
تاثیر میرے شعر میں حُسن بیاں سے ہے

مجموعی حیثیت سے ان پاکیزہ اور شگفتہ نظموں کا یہ گلدستہ اگر ایک طرف انکے ذوق شعری اور حسن بیان کا آئینہ دار ہے تو دوسری طرف وہ مطالعہ کرنیوالوں کیلئے ایک ایسا سدابہار گلشن ہے جو اپنی سرسبزی اور شادابی سے جنت نگاہ ثابت ہوگا اور اپنے رنگ و بو سے ہر مشام جان کو تروتازہ اور معطر بناتا رہے گا۔

(قاضی احمد میاں اختر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقاشِ قدرت

پھل چمن میں سرنگوں ہو کر لٹکتے ہی رہے — پھول ان کو دیدۂ حسرت سے تکتے ہی رہے

بحر کی بیتاب موجیں سر پٹکتی ہی رہیں — کوششِ گفتار میں کلیاں چٹکتی ہی رہیں

کونپلوں نے اپنے منھ کھولے قبائیں چاک کیں — طفلکِ غنچہ نے بھی رنگیں ردائیں چاک کیں

شاخ نے پنجے بڑھائے جستجو کے واسطے — اور زباں پتے نے کھولی گفتگو کے واسطے

جگنوؤں نے اک نرالا آسماں پیدا کیا — جس سے شرمائیں ستارے وہ جہاں پیدا کیا

مرغِ خوش الحاں نے نغمے خیر مقدم کے سنائے — اور عناصر نے نئے اسلوب سے صحرا سجائے

کونے کونے میں پھری بادِ صبا اُڑتی ہوئی — جھانکتی، پتے ہلاتی، دوڑتی، مڑتی ہوئی

اضطرابِ شوق یہ کیوں قلبِ بحر و بر میں ہے
کس کی صنعت کارفرما دہر کے پیکر میں ہے؟

ترانۂ نعت

ترے جلال کا پرتو ہے مہرِ آتش رو

ترے جمال نے بخشی چمن کو زینت و بو

ہیں ابر فیض رسالت کی بارشیں ہر سو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

ہے تو ہی میکدۂ حق کا ساقیِ مہ وش
مے بقا سے ہیں پر تیرے ساغر دلکش
چھلکتے ہیں تیری محفل میں معرفت کے سبو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

ترے چمن ہی کے ہیں خوشہ چیں خلیلؑ و کلیمؑ
ولیٔ عصر رہیں تشنۂ عطائے کریم
جو تیرے چشمہ رحمت سے وہ کریں نہ وضو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

قدم قدم ترا آنکھوں پہ رکھتی تھی دنیا
ہر ایک نقش قدم سے بنی نئی دنیا
گل مدینہ ہی سے باغ خلد کی ہے نمو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

ترے دیار کے ذرّے ہیں مہر کی تمثال
ان آئینوں ہی میں تکتے ہیں چہرہ بدر و ہلال
ہزاروں طور یہاں جلوہ بار ہیں ہر سو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

میں کیا کہوں یہ تری آستاں کی کیا ہے خاک
یہ چشم عالم امکاں کی طوطیا ہے خاک
یہ خاک وہ ہی بنے جس سے آدم خوش خو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

یہ خاک سُرمۂ چشم کمال ہے محمودؔ
یہ خاک غازۂ روئے جمال ہے محمودؔ
اسی سے پائی ہے دنیائے حسن و بوُ نے نمو
"کسے کو خاک درت نیست خاک بر سر او"

شریعت و طریقت

ہو کے آزردہ شریعت نے طریقت سے کہا
تیری دم سے تھی کبھی رونق بازار شہود
موجب فخر تھی میرے لیے، ہستی تیری
مایۂ ناز تھا مذہب کے لئے تیرا وجود
شاخِ پُر گل کی طرح خامہ گل ریز مرا
تیرے ہی ذوق سے اک عمر رہا سر بسجود
میرے انجام میں آغاز جھلکتا تھا ترا
میری تزئین کا موجب تھی کبھی تیری نمود
کیوں تری طرز تغافل کی نہوں شکوہ، گزار
کہ ہوا جاتا ہے وہ رشتۂ الفت مفقود
نکہت گلشنِ عرفاں کی مہک آتی تھی
تیری محفل میں کہاں تھا اثر عنبر و عود!
اب نہ وہ کرخیؒ و جیلانیؒ و شبلیؒ و جنیدؒ
اب نہ ادہمؒ ہے نہ جامیؒ و نظامیؒ موجود
اب نہ وہ بزم نہ وہ شمع شبستاں باقی
نہ وہ ساقی نہ وہ ساغر نہ وہ دَورِ مسعود

ہمتیں پست ہوئیں تیرے طلب گاروں کی — اب ہے وہ ذوق عمل اور ریاضت مفقود
قلب میں بڑھنے لگی نفس پرستی کی ہوس — طبع آزاد ہوئی مائل اوہام ہنود
آہ جس دین نے دی خلق کو باطل سے نجات — آہ جس دین نے کیں شرک کی راہیں مسدود
آج اس دیں میں پڑی قبر پرستی کی بنا ! — آج اس دین میں پجنے لگے لاکھوں معبود
آہ جس دین نے آزادئ فطرت بخشی — آج اس دیں میں نظر آتی ہیں انساں کو قیود
گوش عبرت سے اسے سن کے طریقت آخر — آب گفتار سے دھونے لگی یوں داغِ جمود
ناشناساؤں نے چاہا تو مگر ہو نہ سکا — پر توِ مہر کی صورت مرا جلوہ محدود
کون کہتا ہے کہ مسلک ہو مرا فعل عبث ؟ — کون کہتا ہے کہ تقلید ہے میری بے سود
دیں اگر جسم ہے تو اس کیلئے روح ہوں میں — دیں اگر سقف ہے تو اسکے لئے ہوں میں عمود
ہونا چاہے جو مرے بحر عطا سے سیراب — گوہر اندوز ہوا اب بھی وہ مثالِ محمود

"طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
"ہم چناں در عمل معدن و کان است کہ بود"

تلاش رب

نہایت مضطرب رکھتی ہے دل کو آرزو تیری
حرم کے تنگنے چنواتی رہی ہے جستجو تیری
مثال بلبلِ مہجور میں بھی وقفِ شیون ہوں
بہت آتی رہی ہے میرے لب پر گفتگو تیری

صبا کی طرح میں پھرتا رہا ہوں باغِ ہستی میں
مگر پائی کسی گُل میں نہ خو تیری نہ بُو تیری

دہن کی طرح یہ نکتہ بھی مجھ سے حل نہیں ہوتا
کہ کیوں اس بے نشانی پر ہے شہرت چار سو تیری

مثالِ گُل ہوئے اوراقِ خاطر منتشر لیکن
سیہ بختی نے دکھلائی نہ زلفِ مشکبو تیری

گلستانِ تجسس میں بہت کی میں نے گُل چینی
نہ دیکھی آج تک تیرے رخِ تاباں کی رنگینی

اگر ہے شمعِ روشن میں ترے جلوے کی تابانی
اگر ہے ماہِ تاباں میں یہ تیری ہی درخشانی

اگر رخسارِ گُل میں ہے ترے جلوے کی رعنائی
اگر تو بن گیا ہے دیدۂ نرگس کی حیرانی

اگر تو ہو گیا ہے مضطرب سیماب میں آکر
تری تنویر ہی سے اس قدر شفاف ہے پانی

اگر تیرا غضب ہی آتشِ سوزاں میں پنہاں ہے
اگر تیری تجلی ہی نے دی شعلہ کو تابانی

اگر آب گہر ہی غازۂ رخسار ہے تیرا
اگر تیری خرد کا جزو ہے یہ عقلِ انسانی

تو فرقِ خالق و مخلوق ہی پھر کب رہا باقی!
وہی صہبا وہی ساغر وہی میکش وہی ساقی!

حُور و رضواں

بادۂ خواب نے عالم کو کیا ہے مدہوش
دامنِ شب میں ہوا مہرِ درخشاں روپوش

ڈال کر چہرۂ پرنور پہ بادل کی نقاب
رونق افروز ہوا بامِ افق پر مہتاب

سقفِ افلاک میں سوراخ ہیں مثلِ غربال
ضوئے انجم نہیں چھنتا ہے یہ حوروں کا جمال

آج فردوس میں نکلی ہیں ہوا کھانے کو
دل میں رضواں کے شررِ حسن کے چمکانے کو

بانکپن ان کا نیا، عشوہ نیا، ناز نیا
شوخیٔ طبع نئی اور ہر انداز نیا

اٹھ کے رضواں نے قدم ماہ جبینوں کیلئے
اور کہا وقف ہو تم خاک نشینوں کے لئے

جن کی فطرت میں دغا، جنکی جبلت میں عناد!
جن کی خصلت میں جفا، جنکی طبیعت میں فساد!

حُسنِ دلکش کی مگر تم ہو وہ یکتا تصویر
کہ تخیّل میں بھی انساں کے نہو جس کی نظیر

اور اس حسنِ یگانہ پہ ہے فطرت معصوم
ہے بجا تم ہو اگر شکوہ گزارِ مقسوم

ہو کے خاموش وہ سنتی رہیں رضواں کا کلام
بولی اک حور کہ "اے سروِ گلستاں کے غلام"

کیا یہ وہ گلشنِ جنت نہیں آدم تھا جہاں؟
بے مروّت سرِ تسلیم ترا خم تھا جہاں؟

کیا کبھی خدمتِ انساں پہ تو معمور نہ تھا؟
اس سے پہلے تو کبھی ایسا تو مغرور نہ تھا!

درسِ بصیرت

دست فرہاد بنا تیشۂ بُرّاں کے لئے
ہستیِ قیس ہوئی وقف بیاباں کے لئے

سینۂ بلبلِ مضطر ہے فغاں سے مخصوص
لذتِ سوز ہے پروانہ رقصاں کے لئے

چشمۂ کوہ کی ہر موج گہر بار ہیں ہے
نغمہ ہوش رُبا مرغ غزلخواں کے لئے

منزلِ دہر میں جو نقش قدم ملتا ہے
مشعلِ راہ ہے وہ بے سروساماں کے لئے

کوئی مشکل نہیں دنیا میں جو آساں نہ ہو
عزم بالجزم مگر شرط ہے انساں کے لئے

تیرے میدان شجاعت میں قدم کانپتے ہیں
ننگ ہی ننگ یہ خوددار مسلماں کے لئے

مکتب عشق میں جا درس براہیمی لے
اک نیا کعبہ بنا قوت ایماں کے لئے

بُوئے اخلاص اگر قلب میں پیدا ہو جائے
یہی اک تحفہ بنے محفل عرفاں کے لئے

منتِ مہر درخشاں ہے اُسے موجب ننگ
اک شرر کافی ہو جس سوختہ ساماں کے لئے

آتشِ شوق سے کر بزم چراغاں غافل
دربدر پھرتا ہے کیوں شمع فروزاں کے لئے

عالم ومافی العالم

قطرۂ آب میں ہے سطوتِ قلزم مستور
برق کی موج ہی جھونکے میں ہوا کے معمور

تخم کم مایہ میں پنہاں ہے شجر کی تصویر
ابر نیساں میں نمایاں ہے گہر کی تنویر

تم سمجھتے ہو کہ گیتی کی بنا خاک سے ہے
منسلک اپنا کرہ عالم افلاک سے ہے

بحرِ آتش متلاطم ہے کسی تارے میں
اور آباد ہے دنیا کسی سیارے میں

بزمِ خورشید میں رقصاں نظر آتا ہے کوئی
مثلِ فانوس درخشاں نظر آتا ہے کوئی

عالم اس میں ہیں کئی مہر کئی ماہ کئی
سیکڑوں سال کیا کرتے ہیں طے راہ کئی

قوتِ ثقل سے ہے ہستی اشیاء کو قرار
کششِ مہرِ درخشاں پہ ہے عالم کا مدار

جسم ہر شے کا حرارت سے سوا ہوتا ہے
اس کی تاثیر سے پانی بھی ہوا ہوتا ہے

سمتِ قطبین نہ ہو گر کششِ مقناطیس
اہلِ کشتی کو سمندر میں ملے کون انیس

وصلِ ذرّات سے شیرازۂ عالم ہے بہم
ان حقائق میں بصیرت ہے اگر سوچیں ہم

اُصُولِ صحّت

یوں تو مخلوق کی دنیا میں فراوانی ہے
سب کی فطرت سے جدا فطرتِ انسانی ہے

دہر میں زیست کے قدرت نے جو رکھے ہیں اصول
دیکھیں گر غور سے تو کوئی نہیں ان میں فضول

آکسیجن کو جو پتّوں سے صبا لاتی ہے
مژدۂ زیست وہ انسان کو پہنچاتی ہے

چشمۂ کوہ سے جو قطرۂ آب آتے ہیں
قدر و قیمت میں وہ گوہر کو بھی شرماتے ہیں

گرچہ صحت کی معین اچھی غذا ہوتی ہے
اثر انداز مگر آب و ہوا ہوتی ہے

گرم پوشاک طمازت سے بچاتی ہے ہمیں
عادتِ غسل علالت سے چھڑاتی ہے ہمیں

پانی محتاج کو بھی ملتا ہے نزدیک و دور
اُجلا گر وہ نہیں رہتا تو یہ ہے اس کا قصور

لطف ہر کام کا پابندیِ اوقات سے ہے
عادتِ بادہ کشی فعلِ خرافات سے ہے

کہیں ایسا نہ ہو تم مائل افراط رہو　　اعتدال اچھا ہے مُسرف نہ ہو محتاط رہو

قدر صحت کرو ہستی بشر اس سے ہے

امن اس سے ہی نشاط اس سے ہی زر اس سے ہے

نوروز فلک

نظامِ شمسی کی بزم دلکش میں رقص گیتی کا ہو رہا تھا
فضا کی کاکل میں دست قدرت ہزاروں انجم پرو رہا تھا
فلک کے فرش زمردیں پر کھلے تھے گل بوٹے چاندنی کے
ہوائیں جاروب کش بنی تھیں، سحاب مشکیزے ڈھو رہا تھا

نہال اعمال جن و انساں سبد میں لایا تھا جنکو رضواں
انھیں وہ جنت کے باغ دلکش کے گوشے گوشے میں بو رہا تھا
ہر اک کو تھا شوق خوشخرامی ہر اک کو تھا ذوق خود نمائی
نگار خانے میں مہر کے مہ جبیں کے کچھ داغ دھو رہا تھا

دکھاتی تھی برق جب فتیلہ چلاتا تھا رعد اپنی توپیں
فضا کا چونک اُٹھتا تھا وہ ذرہ جو ایک مدت سے سو رہا تھا
فضا کے قلزم میں مثل کشتی ہزاروں اقلیمیں تیرتی تھیں
کسی کو خورشید اچھالتا تھا کسی کو اس میں ڈبو رہا تھا

حباب کی طرح لاکھوں انجم پھنسے تھے ورطہ میں کشمکش کے
اُبھر کے گر کوئی ہنس رہا تھا تو پھوٹ کر کوئی رو رہا تھا

کُھلا تھا قدرت کا میکدہ اور ہر ایک کو جام بٹ رہے تھے
فرشتے بھرتے تھے خُم سے مینا اور اس سے صہبا اُلٹ رہے تھے

کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا بدل گیا دورِ آسماں کا
بجائے گِل ہو گا نور ہی سے خمیر معمورۂ جہاں کا

چلے گی بادِ نشاط ہر سو فضائے عالم کچھ اور ہوگی
جو خار ہے دشت بیکراں میں بنے گا وہ پھول گلستاں کا

وہ دَورِ امن و اماں رہے گا کہ گوشے گوشے سے گلستاں کے
خزاں کے موسم میں بھی نہ سر کے گا تنکا بلبل کے آشیاں کا

نہ کام آئے گی چیرہ دستی مٹیں گی ظلم و ستم کی راہیں
زبان شمشیر کُند ہوگی گرے گا پھل ٹوٹ کر سناں کا

کہاں کی تفریق رنگ و ملت کہاں کی یہ جنگ نسل و مذہب
چراغ وحدت کی لَو بنائے گی قشقہ پیشانیِ بُتاں کا

جنھیں ہے کچھ ناز ملک و دولت جنھیں ہے کچھ نشۂ فضیلت
وہ خواب غفلت سے اپنے چونکیں قریب ہے وقت امتحاں کا

نظام شمسی میں ہیں جو سیّارے اس کرہ کو وہ تک رہے ہیں
کہ دیکھیں کب اُٹھّیں مہر بنکر وہ ذرّے جو کچھ چمک رہے ہیں

رموز ہستی

رموز فطرت انساں کو بحر بیکراں پایا
ابھی آنکھوں نے کیا دیکھا، ابھی ساحل کہاں پایا!

بہت میخانۂ عالم میں کی پیمانہ گردانی
کسی کو سرنگوں دیکھا، کسی کو خوں چکاں پایا

بدی نیکی کا موجب نیکیوں سے ہے بدی پیدا
نہ کچھ ہستی بدی کی ہے نہ کچھ معیار نیکی کا
مگر طرز عمل سے ذہن میں جو آگیا نقشا
کہا نیکی کسی نے اس کو اور کوئی بدی سمجھا
"رموز فطرت انساں کو بحر بیکراں پایا"

کوئی آئینِ ملکی کے دلائل بحث میں لایا
کسی نے صیقل آئینۂ اخلاق بتلایا
کسی نے رسم و مذہب کا نتیجہ اس کو ٹھہرایا
کسی کو کچھ نظر آیا، کسی کو کچھ نظر آیا
"ابھی آنکھوں نے کیا دیکھا ابھی ساحل کہاں پایا"

بہت سے مسئلوں میں گم ہے اب تک عقلِ انسانی
نظر آتی نہیں اس کو تجلیات روحانی

کسی نے اس مئے رنگیں کی صورت تک نہ پہچانی
دکھائی گرچہ نورِ مہر بن کر اس نے تابانی
"بہت میخانۂ عالم میں کی پیمانہ گردانی"

ریاضِ دہر کی ہر شے میں اک رازِ نہاں پایا
یہاں کے تخم بے مایہ میں عکس گلستاں پایا
کوئی ماہر ملا ان کا نہ کوئی راز داں پایا
"کسی کو سرنگوں دیکھا، کسی کو خوں چکاں پایا"

مراحل تخلیق

دامنِ فضا میں کچھ جُنبشیں ہوئیں پیدا
ذرّہائے ساکن میں حشر ہو گیا برپا
ذرّوں کے تصادم سے کانپتی ہوا نکلی
آسماں کے گوشے میں ابر بن کے جا نکلی
ابر اپنی رنگینی اس فضا میں چھوڑ آیا
اور رشتۂ ہستی نیستی سے جوڑ آیا
موج بن کے اُبھرا تھا میں بھی بحرِ ہستی سے
لاکھوں اوج پیدا تھے آہ میری پستی سے
ساحلِ حوادث سے جب میں آ کے ٹکرایا
قطرے رہ گئے باقی، موج کو فنا پایا
دامنِ عدم میں پھر جذب ہو گئے وہ بھی
اور فضا میں سب جوہر اپنے کھو گئے وہ بھی

تخلیقِ عشق

گلزارِ ازل کے تخموں میں تاثیرِ نمو روپوش ہوئی
غنچوں سے ٹپکا بادۂ حسن اور خود قدرت مینوش ہوئی

اس گلشن کا پتا پتا گنجینہ تھا زیبائی کا
اس منظر کا ذرہ ذرہ آئینہ تھا رعنائی کا

جو قطرۂ شبنم تاباں تھا وہ تشنۂ دیدۂ شیدا تھا
گو غنچہ و گل رنگیں تھے مگر اک یاس کا عالم پیدا تھا

جب حسن کی فطرت شوخی کو فرمانِ نمائش دیتی تھی
جذبات کے گہوارے میں پیہم کوئی شئے کروٹ لیتی تھی

شوخی و حیا کے ہنگاموں نے حشر بپا کر رکھا تھا
عشق کا پیکر حسن ہی میں قدرت نے بنا کر رکھا تھا

مصحفِ عالم

روز و شب کچھ بھی نہیں مصحفِ عالم کا مگر
ورق تازہ الٹتا ہے فلک سے خورشید

اہلِ عبرت کے لئے اہلِ بصیرت کے لئے
ہر ورق صورتِ سابق کا ہی اک عکسِ جدید

صاحبِ فہم و فراست ہی نے کچھ سمجھا ہے
کہ یہ آئین ہی ہے بابِ ترقی کی کلید

ان کے اقوال کی گر ہم بھی کریں پابندی
ہم کو بھی دہر میں حاصل ہو حیاتِ جاوید

وہ اولو العزم ابھی زندہ ہیں فسانے ان کے
تھی شکست ان کے لئے ایک ظفر کی تمہید

وہ یہ کہتے تھے کہ دنیا میں ہجومِ حرماں
مقتضی ہے کہ کرے نوعِ بشر سعی مزید

تیری عبرت کے لئے موردِ گس کافی ہیں
مول ملتی ہو تو جا عقل و خرد ان سے خرید

کارنامے ہی بزرگانِ سلف کے محمودؔ
عالمِ یاس میں دیتے ہیں مسرّت کی نوید

حُرّیت

گلستاں میں آکر صبا ہو گئی تو
شمیمِ گلِ جاں فزا ہو گئی تو

چٹک بن کے نکلی کلی کے دہن سے — کہیں برگِ رنگیں قبا ہو گئی تو
کہیں ابرِ تو بر شکن بن کے آئی — کہیں قوسِ ابرو نما ہو گئی تو
کہیں کھل کے پیمانۂ گل بنی تو — کہیں پس کے رنگِ حنا ہو گئی تو
کہیں رزم گہ سے سناں بن کے چمکی — کہیں نوکِ تیغِ دوتا ہو گئی تو
کہیں شیون روح فرسا بنی تو — کہیں نغمۂ دل کشا ہو گئی تو
مساجد میں تکبیرِ حق بن کے آئی — منادر[1] میں بت کی ادا ہو گئی تو
کبھی کارواں میں جرس بن کے گونجی — بیاباں میں بانگِ درا ہو گئی تو
سمندر سے موجِ رواں بن کے ابھری — کفِ آب میں بلبلا ہو گئی تو
کبھی آبِ ساکن میں طوفاں اٹھایا — بخارات بن کر ہوا ہو گئی تو
کہاں تیرا جلوہ نہیں آشکارا — مرے دل میں بھی رونما ہو گئی تو

امید

رفعت کی فضا میں رہنے والی — ہنس ہنس کے غموں کو سہنے والی
دشتِ حرماں میں دل کی دمساز — میدانِ عمل کی مردِ جانباز
گلشن کی بہار تیرے دم سے — بسمل کو قرار تیرے دم سے
مرغانِ چمن کی نغمہ سنجی — پروانہ کا جذبۂ سپندی
یہ کشتیاں بحرِ بیکراں پر — سیارے ہوں جیسے آسماں پر

---

[1] مندر کی جمع منادر غلط العام سہی مگر رائج ہے۔

تابانی شمع و رونق بزم — عُریانی تیغ و گرمیِ رزم

ہر شے پہ ہے تیری حکمرانی — ہے تو ہی چراغ زندگانی

گہوارۂ طفل بے زباں تو — پیری میں عصائے حفظِ جاں تو

تو مستیِ چشمِ فتنہ پرور — تو کیفِ مے سرور آور

تو بُرّشِ ابروئے بتاں ہے — تو غازۂ حسنِ دلستاں ہے

ہر غمزے میں ہے ترا اشارہ — ہر رنگ میں تو ہے آشکارا

اے خار کو گل بنانے والی — ظلمت میں ضیا دکھانے والی

ناکامیٔ دل ہے یاس افزا — ماحول الم میں ہوں سراپا

درکار ہے تیری دست گیری — کرتی نہیں میری دستگیری

محمودؔ کی کارساز بن جا
دلگیر کی دل نواز بن جا

شاعر محفلِ عالم میں

نوحۂ مرگ کہیں ہے کہیں شادی کا جلوس
اور کہیں دست و گریباں ہیں نصاریٰ و مجوس
کر رہا ہوں میں عجب فطرت انساں محسوس
گوشۂ محفل عالم میں کھڑا ہوں مایوس
اہل محفل مرے واقف نہ میں ان سے مانوس!

ہم نوا کوئی نہ غم خوار نہ دم ساز کوئی
جانتے ہیں کہ چلا آیا ہے غماز کوئی
سمجھے کس طرح مرے نوحہ کا انداز کوئی
ہم زباں کوئی نہ ہمدرد نہ ہم راز کوئی
ہو کے آزاد بھی گویا ہوں قفس میں محبوس

انکشافات حقائق ہیں یہاں مدّ نظر
حسن صورت کا طبیعت پہ ہو کیا خاک اثر
نظر آتے ہیں کمالوں میں نقائص مضمر
فرش گیتی پہ ادھر چشم تجسس ہے اُدھر
رقص ہے شاہد ہستی کا بشکل طاؤس

دانۂ سبحہ کو تاثیر پہ تھا کیا کیا ناز
کر گئی نکہت غنچہ کی طرح وہ پرواز
اب عمامہ میں نہ تقویٰ نہ عبا میں اعجاز
خرقۂ شیخ سے ہوتا ہے عیاں رنگ مجاز
ہے تنِ زاہد صد سالہ ریا سے ملبوس

شیشۂ دل ہے یہاں سنگ مقاصد سے چُور
ہے پرستش میں ریا اور عبادت میں غرُور
بادۂ حرص و ہوس کا ہے دماغوں میں سُرور

شورِ دنیا طلبی ہی سے ہیں معبد معمور
کیسی آوازِ اذاں اور صدائے ناقوس

آہ بے ربطیٔ شیرازۂ ہمت کی دلیل
نالۂ دیوانگی و خبط کی حدِ تکمیل
گیا رہی شاہدِ عصمت کے بچانے کی سبیل
عشق حیواں صفت اک جذبۂ فاسد کا کفیل
فکرِ انجام نہ اندیشۂ ننگ و ناموس

دل طلب گارِ جفا مائلِ نخوت طلبی
چشم آمادۂ آشوب و ہلاکت طلبی
زلف شرمندۂ مشاطہ و زینت طلبی
حسن مشتاقِ تنک ظرفی و دولت طلبی
منزلت اپنی عیاں اور نہ فطرت محسوس!

ہے اگر رنگِ فنا غنچہ کی رعنائی میں
داغ کلفت کا نشاں لالۂ صحرائی میں
سحر کاریٔ چمن دہر کی زیبائی میں
نوحۂ پیماں شکنیٔ بلبلِ ہرجائی میں
بوئے گل رازِ گلستاں کی جہاں میں جاسوس

مدعا دل کا رہا صورت عنقا معدوم

راز ہستی کا نہ اب تک کوئی سمجھا مفہوم
ذہن قاصر رہا ادراک و تجسس محروم
کاوش فکر عبث، سود تخیل معلوم
گلشن دہر کا جگنو ہے خرد کا فانوس

ترک مقصد ہی سے حاصل ہوا دل کا مقصود
نبھ سکے مجھ سے زمانے کے نہ یہ رسم و قیود
دیدۂ شوق میں ہے جلوۂ بازار شہود
اس جہاں کا ہوں میں گم گشتۂ منزل محمود
ہے جہاں کاسۂ گدائی کا سر کیکاؤس

ابر و شاعر

ای ابر جب زمیں پر تو بن کے آئے پانی
گلزار دہر میں ہو میری بھی دُرفشانی
میں بحر علم سے کچھ کسب کمال کر کے
حکمت کے موتیوں کو سینے میں لاؤں بھر کے
تیری طرح سے میں بھی فیاضیاں دکھاؤں
بزم ادب میں اپنے علمی گہر لٹاؤں
نسرین تشنہ لب کو سیراب جب کرے تو
اور اپنی مے سے لالے کا جام جب بھرے تو
میں بادۂ محبت کا جام دوں وطن کو
وابستہ کر کے چھوڑوں افراد انجمن کو
تو گلستاں کو بخشے جب اک حیات تازہ
رخسار گل پہ چھڑکے جب دلکشی کا غازہ
محمودؔ دل میں غنچہ امید کا کھلائے
اہل وطن کو اپنی حُبّ وطن دکھائے

ستارہ

کیا شمع جل رہی ہے یہ منزلِ فلک پر
حور رہروانِ عقبیٰ کی بن گئی ہے رہبر؟
روزن ہوا کسی کے بندِ نقاب میں کیا؟
الجھن بھی شوخیوں کو ایسی حجاب میں کیا؟
بزمِ فلک میں کوئی فانوس ضو فگن ہے!
یا بحرِ نیلگوں میں رعنائیٔ چمن ہے!
جگنو چمک رہا ہے گلزارِ آسماں میں
یا یہ حباب تاباں ہے بحرِ بیکراں میں
یہ ہار کا کسی کے موتی بکھر کے ٹوٹا!
یا ماہ کی قبا کا اک رہ گیا ہے بوٹا!
اب اے چمکنے والے تو خود بتا کہ کیا ہے
سنتا ہوں میں کہ عالم تو ایک دوسرا ہے؟

گل گشت

اک دن وفورِ غم نے جو بیتاب کر دیا
سیرِ چمن ہوئی دلِ ناشاد کو پسند
پہونچا تو دیکھیں یادِ بہاری کی شوخیاں
اوراقِ گل کو کھول کے وہ کر رہی تھی بند
بیٹھے تھے چپے چپے پہ گلشن کے پاسباں
خاروں کی تھیں سنانیں تو سنبل کی تھی کمند
شمشیرِ آبدار تھی ہر موجِ آب جو
تھی بوئے گل "سوار" تو بادِ صبا "سمند"
سبزے کے لہلہانے سے شکلِ زمیں یہ تھی
اوڑھے ہوئے ہو جیسے کوئی چادر پرند
فرحت ہوئی جو دل کو تو سمجھا کہ واقعی
نظّارہ فصلِ گل کا ہے داروئے دردمند
مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو نازک سی اک کلی
بیٹھی ہے آہ سرد کو سینے میں کر کے بند

مجھ سے چٹک کے بولی کہ مجھ دلفگار کو
صدمہ خزاں سے فصل بہاری کا ہی دوچند
تو مجھ سے پوچھ دہر کے اسباب انقلاب
سن مجھ سے تو وہ بات کہ ہو تجھ کو سودمند
یاں ہر فغاں مرگ ہی اک مژدۂ حیات
یاں پست کر کے ایک کو ہو دوسرا بلند
بلبل کی طرح شور و فغاں سے نہ کام لے
ایسا نہ ہو کہ تجھ کو بھی پہنچے کوئی گزند
عبرت سے دیکھ نرگس حیراں کو باغ میں
جو شیوۂ سکوت پہ رہتی ہے کاربند

"غافل مشو زگل کہ فرو رفتگان خاک"
این نامہ را بہ خون دل انشا نمودہ اند"

شامِ غم

گلشن میں صورت گل خنداں ہوئی اُداس
رنگت میں دلکشی نہ نزاکت نہ بو نہ باس
ظلمت کی چھا گئی ہیں گھٹائیں جو آس پاس
ہر مرغ آشیاں میں ہے تصویرِ درد و یاس
تیرِ شعاع مہر جو ڈوبے لہو میں ہیں
زیرِ فلک نہ آئیں سب اس جستجو میں ہیں

پیدا ہے چرخ پیر سے نیرنگیِ سراب
ظاہر کہاں شفق سے ہے انجم کی آب و تاب
دریائے خوں میں ڈوب رہا ہی جو آفتاب
رونے کو ہو گئے ہیں عیاں دیدۂ حباب
مشکل کشائی کرتا ہے ناخن ہلال کا
کھلتا نہیں کسی طرح عقدہ ملال کا

روتی ہے گرچہ شمع مگر اس میں جاں نہیں
پروانہ جاں نثار ہے پر خونفشاں نہیں

آشفتہ سر ہے گل مگر اس کی زباں نہیں
بلبل ہے نوحہ سنج مگر خوش بیاں نہیں

میری فغاں کا طور نرالا جہاں سے ہے
تاثیر میرے شعر میں حسن بیاں سے ہے

ہسپانیہ کا اجڑا ہوا باغ

فسونِ خواب نے مدہوش کر دیا تھا مجھے
غمِ جہاں نے فراموش کر دیا تھا مجھے

یہی نہیں کہ فقط حدِّ آسماں تک تھی
مری نگاہ کی پرواز لامکاں تک تھی

جہانِ خواب میں حاصل ہوئی تھی بیداری
جھلک رہی تھی مری بیخودی میں ہشیاری

وہ اوجِ ملتِ بیضا مرے دماغ میں تھا
کیا جو غور تو ہسپانیہ کے باغ میں تھا

مگر وہ دلکشی صحنِ باغ و رنگینی
مرے تصورِ رنگیں ہی کی تھی گل چینی

وہ باغ جس میں خزاں بھی بہار بن کے پھری
ستم ہے آتشِ گل اس میں برق بن کے گری

نگاہِ یاس سے اک غنچہ مجھ کو تکتا تھا
میں اُس کا حالِ زبوں کس سے پوچھ سکتا تھا؟

اسی سے میں نے کہا اے بہارِ رعنائی
ترے نصیب کی دنیا میں تھی یہ رسوائی!

ریاضِ دہر میں آیا تھا خوار ہونے کو ؟
ملول و منتشر و دل فگار ہونے کو؟

شمیمِ گل سے ترا عطردان خالی ہے
عجیب روح گسل تیری پائمالی ہے

سنا تھا میں نے کبھی تیرے گلستاں کی شمیم
چلایا کرتی تھی مغرب کے گلشنوں میں نسیم

دیا تھا تو نے ہی حُسنِ خرد دماغوں کو
جو بخشتا تھا ضیا علم کے چراغوں کو

سنا تھا میں نے کہ اس خاکِ گلستاں کا خمیر
بنایا کرتا تھا عالم میں حسن کی تصویر

وہ دل کشی نہیں پاتا میں تیرے دامن میں
نظارہ دشت کا کرتا ہوں تیری گلشن میں

وہ گل وہ برگ وہ دامانِ مشک بو نہ رہا
وہ نکہتیں نہ رہیں تیری اور وہ تو نہ رہا

نہ پہنچی تھی ابھی تکمیل کو مری گفتار
کہ کھولا غنچۂ پژمردہ نے لب اظہار

کہا کہ میرے گلستاں سے تجھ کو نسبت ہے
میں جانتا ہوں کہ مجھ سے تجھے عقیدت ہے

مگر خدا کے لئے میرا حال زار نہ پوچھ
یہاں میں کیوں ہوں پریشان و دلفگار نہ پوچھ

اگر ہے شکوۂ غمازیِ نسیم تجھے
ہے گر شکایت حسنِ گل و شمیم تجھے

تو اس طرح کے گلے جا کے باغباں سے کر
اُسے نہ پائے تو پھر اس کے آستاں سے کر

میں غنچہ رمزِ گل و گلستاں کو کیا جانوں
تغافل و ستم باغباں کو کیا جانوں

مگر تو ہند سے اس سرزمیں میں آیا ہے
یہاں بھی جذبۂ دیں تجھ کو کھینچ لایا ہے

تجھے خبر ہے میں کس گلستاں کا غنچہ ہوں
یہ اور بات ہے پژمردہ یا شگفتہ ہوں

نظر اٹھا کے ذرا گلستاں کے حال کو دیکھ
مجھے نہ دیکھ مگر تو مرے مآل کو دیکھ

ہے باغبان ہی موجب مری تباہی کا
میں شکوہ سنج اسی کی ہوں کم نگاہی کا

جو رشتہ ہم میں اخوت کا تھا وہ ٹوٹ گیا
جو گلچیں آیا وہ گلشن کو آ کے لوٹ گیا

ابھی تو ہند میں زندہ ہے درسِ عبرت لے
فلک کے ہاتھ سے اپنی گزشتہ عظمت لے

فنا کے ورطے میں نادان پھر رہا ہے تو
سنا ہے قعرِ مذلّت میں گر رہا ہے تو!

حدیثِ میکدہ

کسی میخوار سے پیر مغاں نے یہ کہی اچھی
کہ ظاہر کچھ خودی بھی جس سے ہو وہ بیخودی اچھی

سرورِ بادہ کا احساس ہی گر ہو گیا زائل
تو اس ناگفتہ ہستی سے تیری نیستی اچھی

اگر جویائے ساغر ہے تو دل میں ظرف پیدا کر
تو پہلے مستحق تو بن نہیں یوں میکشی اچھی

کہاں اک بچہ سا نو وارد کہاں آدابِ میخانہ
چلا آتا ہے رندوں میں رہی یہ دل لگی اچھی

ترا مقصود مینوشی سے بس ہرزہ سرائی ہے
تجھے پینے سے مطلب ہے جو بہل جائے وہی اچھی

جو وارفتہ ہوا تو جذبۂ بے اختیاری سے
مرے نزدیک غم اچھا نہ پھر تیری خوشی اچھی

نہ کیفِ بادہ و اسرارِ مے نوشی ہی تو جانے
نہ یہ سمجھے کہ ہے پیرِ مغاں کی دوستی اچھی

نکل صف سے نہ کر بدنام ناحق بزمِ رنداں کو
کہ اس رسوائی سے واللہ تیری دشمنی اچھی

حدیثِ غنچہ

چھیڑ دیا بہار نے پردۂ چمن کے ساز کا
موج ہوا میں کیف ہے نغمۂ جاں نواز کا

نکہتِ باغ روح بخش زینتِ باغ دلفریب
سنبلِ باغ مشک بُو نرگسِ باغ دیدہ زیب

شاخِ شجر کا برگ برگ بن گیا مطربِ چمن
پھولوں کی ڈالیوں میں ہے حُسنِ عروسِ گلبدن

ماہ کے بامِ چرخ پر ابر کی شال دوش پر
شوخیاں کھیلتی ہوئی اس کے لبِ خموش پر

جھونکوں سے بادِ سرد کے آتشِ گل فزوں ہوئی
کثرتِ برگ و بار سے شاخِ شجر نگوں ہوئی

گوشۂ صحنِ باغ سے دھیمی سی اک صدا ہوئی
یعنی شگوفے کی صبا آ کے گرہ کشا ہوئی

روحِ حیات تھی دواں گرمیٔ جستجو کے ساتھ
دل میں تھا شوقِ انبساط جاتا رہا وہ بُو کے ساتھ

حسرتیں نکلے بوئے گل دوشِ صبا پہ اُڑ گئیں
پتیاں سوکھ کر شاخ پر اس کی مُڑ گئیں

حسن و جمال و رنگ و بو ہو گئے جب سپردِ خاک
پھاڑ کے دامنِ قبا کر لیا اس نے سینہ چاک

اس کی مآلِ حسن پر آہ ذرا نظر نہ تھی
دہر میں کیا ہو رمزِ زیست، اس کی اُسے خبر نہ تھی

کشمکشِ حیات کا لطف ہے انتظار میں
لیتا ہے شوق کروٹیں عالمِ انتشار میں

ہوتی ہو سیر چشمِ شوق جلوۂ بے نقاب سے
رہتا ہو حشر آرزو دل میں بپا حجاب سے

ولولۂ نظر کشا، جرأتِ دہر آفریں
غلغلۂ فلک رسا گریۂ بحر آفریں

حسن کی دلربائیاں عشق کی جاں نثاریاں
جذب کی بے قراریاں، عقل کی پردہ داریاں

عشوۂ جاں ستاں کی یاد غمزۂ ناروا کی دُھن
اور دلِ غم پرست کو ناوکِ دل رُبا کی دھن

حسرت و اشتیاق کا ایک ہجوم دل نشیں
عزم کی جانسپاریاں یاس کی وہ "نہیں نہیں"

چشم کی اشکباریاں، ہجر کی دل گدازیاں
وصل کے انتظار میں شوق کی دل نوازیاں

لطفِ حیات الغرض ضبط کی کوششوں میں ہے
جذبۂ شوق کی کشش ہجر کی کاوشوں میں ہے

ہیں تری نامرادیاں وجہ ترے ثبات کی
اور حصولِ مدعا موت ہے حیات کی

دل سے خطاب

نہ کچھ فکرِ جزا تجھ کو نہ کچھ خوفِ سزا تجھ کو
یہ آخر کیا ہوا ہے اے دلِ بے مدعا تجھ کو؟

تجھے خود اپنی ہستی پر بھی شک ہوتا ہے رہ رہ کر
نہ اقرارِ بقا تجھ کو نہ انکارِ فنا تجھ کو!

کہاں تک روحِ غم بھرتا رہے گا قلبِ ہستی میں
ملے گا فکرِ وہم افزا سے اے ناداں کیا تجھ کو ؟

تجھے ہر وردِ پنہاں کی نئی تاویل ملتی ہے
نظر آتی ہے راحت میں بھی مضمر ابتلا تجھ کو !

نظامِ دہر میں تیری بھی فطرت کوئی فطرت ہے
نہ دولت کی خوشی تجھ کو نہ عُسرت کا گِلا تجھ کو

تری فیاضیاں اللہ اللہ اس غریبی پر
تو دولت بھی لٹا دے گر وہ بخشے کبریا تجھ کو

تری خاطر خمیرِ فطرتِ انساں نہ بدلے گا
کہاں سے لاکے دے کوئی رفیقِ بے ریا تجھ کو

خدا معلوم تو کرتا ہے کس عالم کا نظّارہ
نظر آتی ہے ذرّے ذرّے میں شکلِ وفا تجھ کو

بدل دے اپنی فطرت کو کہ آئینِ کہن بدلا
زمیں بدلی، فلک بدلا، زمانے کا چلن بدلا

بچہ اور کھلونا

(بچوں کے لیے)

بستر پہ چھوٹا بچہ ہاتھوں اُچھل رہا ہے   چادر اُلٹ گئی ہے اور سر نکل رہا ہے

رہ رہ کے اپنے بازو بستر پہ مارتا ہے
پاؤں کے بل کھسک کر سینہ ابھارتا ہے

کرتا ہے لیٹے لیٹے ورزش اسی بہانے
سیکھے گا آگے چل کر اپنے قدم بڑھانے

یہ خود ہی گھورتا ہے آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر
اور آپ ہنسنے لگتا ہے خوب کھِل کھلا کر

ماں آکے جب بدلتی ہے دوسرا بچھونا
اور کھیلنے کو دیتی ہے ہاتھ میں کھِلونا

مٹھی میں اس کو لے کر جبڑوں سے کاٹتا ہی
اور جان کر مٹھائی ہونٹوں سے چاٹتا ہے

یہ کیا ہی؟ کس لئے ہی؟ اس کو خبر نہیں ہے
اور ٹوٹ پھوٹ جائے اسکا بھی ڈر نہیں ہے

میں بھی بساط عالم کو جانتا بچھونا
اور اس کے سیم و زر کو گردانتا کھلونا

فطرت کی طرح خو بھی معصوم و نیک ہوتی
سنگ و گہر کی وقعت نظروں میں ایک ہوتی

انجام کا طبیعت کو پاس ہی نہ ہوتا
اور انبساط و غم کا احساس ہی نہ ہوتا

تربیت اطفال

ذرّۂ دہر میں ہے نور قمر جلوہ فگن
سینۂ تخم میں ہے عکس شجر جلوہ فگن

صاعقہ پاش ہے گو موج رواں دریا میں
دیکھنے والا مگر کوئی نہیں دنیا میں

شاخیں گر صحن گلستاں سے نہ ہوتیں روپوش
ان میں ہر رنگ کے گل ہوتے وہاں جلوہ فروش

قطرے کچھ بطنِ صدف سے جو نہ باہر گرتے
وہ گہر بنتے کہ نظروں سے یہ گوہر گرتے

آہ اطفالِ وطن آج جو آوارہ ہیں
ماہ بے نور ہیں، آئینہ ناکارہ ہیں

صیقل علم سے گر ان کو جلا دی جاتی
ان کے سینوں ہی سے تنویر خرد لی جاتی

معلم سے خطاب

اے معلّم اے شناسائے رموزِ کائنات
معدن علم و ادب اے گنجِ اسرار و نکات

رہبرِ راہ طریقت ۔ واقفِ رمزِ مجاز
نکتہ سنج و نکتہ پرور ۔ نکتہ داں ۔ نکتہ نواز

اے کہ تیری خامشی پر نطق کی لذت نثار
اے کہ تیری جُنبشِ لب باغِ معنی کی بہار

اے کہ تیرے فیض سے رنگینیٔ بُستانِ خُلق
اور قبائے شاہدِ عصمت ترا دامانِ خُلق

غالباً تجھ کو نہیں معلوم کیوں آیا ہوں میں
اپنے گلشن کا شگوفہ اک یہاں لایا ہوں میں

اس کی فطرت ہے ابھی ناآشنائے رنگ و بو
اس کی ہستی پیکرِ معصومیت ہے ہو بہو

بخش دے رنگینیاں اس کو جمالِ علم کی
کھینچ دے تصویر اس میں خدّ و خالِ علم کی

آتشِ کبر و ریا سے اس کا سینہ پاک ہے
گردِ عصیاں سے بھی یہ آئینہ اس کا پاک ہے

اس کو کچھ آغاز کی کاوش نہ فکرِ انجام کا
اور نہ اب تک یہ ہدف ہے گردشِ ایّام کا

آب کی صورت ہے تو جس سمت چاہے چھوڑ دے
موم کی مورت ہے تو جس سمت چاہے موڑ دے

تربیت گاہوں کی اہمیت

یہ مُسلّم ہے کہ اب ہند کے ہر گوشے میں
آتش افروز ہوئے ہیں شررِ بغض و نفاق

ہند کی خاک کے ذرّے بھی تو لَو دیتے ہیں
سنگِ رہ شعلہ فشانی میں ہیں مثلِ چقماق

عود کر آئی ہیں کچھ ایسی بہیمانہ صفات
قتل و غارت ہی کا ہر فردِ وطن ہے مشتاق

جسکو نظارۂ شمشیر تھا پیغام اجل
آج شمشیر زنی میں ہے وہ پورا مشاق

جہل و نخوت سے بمشکل کوئی دل خالی ہے
اس پہ یہ طرّہ کہ سر میں ہمہ دانی کا مراق

کوئی کرتا ہی نہیں حُرمت جذبات کا پاس
قابل غور ہو کیا مسئلہ استحقاق؟

خانہ ویرانی پہ ہر فرد بشر مائل ہے
چاہتا ہے کہ کرے قضیۂ ہستی بے باق

ملک و ملت کے اکابر ہیں اسی کوشش میں
کوئی مسموم فضا کے لئے ڈھونڈیں تریاق

وہ بھلا کیسے نکالیں گے جراثیم عناد
ہو چکا جن کا ہماری رگ و پے سے الحاق؟

کیا کریں گے اُسے تلقین رواداری کی
رکھ دیا جس نے شرافت ہی کو بالائے طاق!

مدرسے جا کے کوئی ہو کہ نہ ہو حرف شناس
یہ ضروری ہے کہ ہوں اس کے مکمل خلاق

نسلِ نو میں یہ معائب بھی رہیں گے جبتک
تربیت گر کا مدارس سے نہ ہوگا الحاق

ورنہ لڑتی ہی رہے گی یہ درندوں کی طرح
اس کی فطرت میں بڑھا جتنا شجاعت کا مذاق

اُردُو زبان

ہم متحد آپس میں ہیں اُردو ہی کے دم سے
گہوارۂ الفت میں پلی ہے یہ جنم سے
وصف اس کے جو معلوم نہ ہوں تو سنو ہم سے
یہ گونجی ہے کنشت میں جو اُٹھی ہے حرم سے
زُنّار کو تسبیح کے دانوں میں پرو یا
اور قطرۂ زمزم سے لب گنگ کو دھویا

خوں سینچا ہے لاکھوں نے تو یہ نخل اُگا ہے
مٹی میں ہزاروں ملے جب پھولا پھلا ہے
ہر پھول کی خوشبو الگ اور رنگ جدا ہے
اور کیوں نہ ہو ہر شاخ میں پیوند لگا ہے
جس نخل کے ہر گل کا ورق رشک چمن ہو
انصاف سے کہئے وہ نہ کیوں فخر وطن ہو؟

یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ مسلم کی زباں ہے
سب بولتے ہیں اس کو مروج یہ جہاں ہے
اس ملک میں سکّہ اسی بولی کا رواں ہے
سچ کہئے تو صدیوں سے چلن اس کا یہاں ہے
جو اس کو سمجھتا نہ ہو ایسا نہیں کوئی
ممکن ہے کہ ہو ہند سے باہر کہیں کوئی!

ہر قوم کو مسند پہ بٹھایا ہے اسی نے
اور تفرقہ مذہب کا مٹایا ہے اسی نے
احساس وطن ہم کو دلایا ہے اسی نے
اس خاک کو اکسیر بنایا ہے اسی نے
اب شوکت دیرینہ نہ وہ شان شہی ہے
بس ترکۂ اجداد میں اردو ہی رہی ہے

دنیا میں ہیں چوٹی کی زبانیں کوئی دو چار
گو وسعت لفظی میں کوئی کم نہیں زنہار
ہر رمز کا کر سکتے ہیں ہم ان میں بھی اظہار
لیکن نہ یہ شوخی ہے نہ یہ لذت گفتار

اردو کی فصاحت کا تو عالم ہی نیا ہے
اس کے لب و لہجہ پہ ترنم بھی فدا ہے

جو حرف ہے اُردو کا وہ مصری کی ڈلی ہے
جو لفظ ہے گلزارِ فصاحت کی کلی ہے
جو بات ہے اخلاق کے سانچے میں ڈھلی ہے
اور کیوں نہ ہو یہ شاہوں کے محلوں میں پلی ہے

شائستگی الفاظ میں آئی ہے وہیں سے
اس سحر بیانی کو یہ لائی ہے وہیں سے

تدبیر کوئی غیب سے ایسی نکل آئے
اس گلشن اردو میں بہار ازل آئے
جو تخم اُگے یا جو کوئی پھول پھل آئے
وہ اپنی دل آویزیوں میں بے بدل آئے

اب نکہت جاں بخش اسی کی ہو جہاں ہو
یعنی یہی ہر خطہ عالم کی زباں ہو

داستانِ عبرت

اک نوجوان مصر مجھے ریل میں ملا
جو صاحبِ خرد بھی تھا، حاضر جواب بھی

میرے قریب بیٹھے تھے مدراس کے بزرگ
تھا شوقِ گفتگو بھی جنھیں اجتناب بھی

یونہی سی جانتے تھے وہ اردو زبان اور
کچھ اس کے بولنے میں انھیں تھا حجاب بھی

خُو بُو میں ظاہرا تو وہ مغرب زدہ سے تھے
اور مغربی ہی تن پہ تھی پوشاک خواب بھی

انگلش میں میرا نام و وطن پوچھنے لگے
میں نے اسی زباں میں دیا پھر جواب بھی

حیرت سے ہم کو تکنے لگا وہ جوانِ مصر
چہرے پہ اس کے رنج بھی تھا اضطراب بھی

کہنے لگا وہ مجھ سے کہ ہندی ہیں آپ تو؟
اہلِ وطن ہیں آپ ہی کے یہ جناب بھی؟

کیا مشترک زبان کوئی ہند میں نہیں؟
گر ہے تو آپ کرتے اسی میں خطاب بھی

بالفرض گر نہیں، عربی فارسی تو تھیں
انگلش ہی کو کیا جو کیا انتخاب بھی!

یہ سن کے میں تو شرم سے خاموش ہو گیا
شرمندگی کے ساتھ ہوا لاجواب بھی

اس نوجواں کا عارضِ رنگیں شگفتہ تھا
اور اس شگفتگی میں تھا کچھ رعب داب بھی

بجلی گرا رہا تھا نگاہوں سے بار بار
کیا چیز ہے جہاں میں عہدِ شباب بھی!

پوچھا جو میں نے آپ مسلماں ہیں یا یہود؟
بولا میں کیا بتاؤں ہیں عاقل جناب بھی

مذہب کا واسطہ تو خدا سے ہے یہ سوال
وہ مجھ سے پوچھتا تو میں دیتا جواب بھی!

درسِ حقیقت

دیکھ ادھر کو بھی ذرا محوِ تماشائے بہار
تک رہے ہیں تجھے پژمردہ نہالانِ چمن
تیری فیاض نگاہوں سے جو ہوں گے سرشار
گل خوش رنگ سے بھر دیں گے یہ دامانِ چمن

حسنِ قدرت کے طلب گار یہ حیرت ہے کہ تو
کیا دلدادہ ہے گل زار کا کہساروں کا
نگہ شوق تری ڈھونڈتی ہے گل کا سبُو
اور خیال آتا نہیں تجھ کو کبھی خاروں کا

تو نے جس سبزے کو بیگانہ سمجھ رکھا ہے
اپنے قدموں سے جسے کرتا ہے اکثر پامال
بے خبر یہ گل رنگیں سے کہیں اچھا ہے
تجھ کو معلوم نہیں حسن دوروزہ کا مآل

سنبل و غنچہ و گل، برگ و ثمر سبزہ و خار
صحنِ گلشن میں بنا سب کی اسی خاک سی ہے
سب یہ ہے لطفِ صبا سب یہ ہی احسانِ بہار
اور تعلق انھیں مشاطہ افلاک سے ہے

رازِ مسرّت

رموزِ فطرتِ انساں کو بحرِ بیکراں پایا
ابھی آنکھوں نے کیا دیکھا ابھی ساحل کہاں پایا

بہت میخانۂ عالم میں کی پیمانہ گردانی
کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو خوں چکاں پایا

مثالِ گل جسے دیکھا بظاہر شادماں ہم نے
دلِ صد چاک میں اسکے بھی اک زخمِ نہاں پایا

غرض معمورۂ عالم پہ کیفِ رنج طاری تھا
یہی دیکھا جہاں دیکھا یہی پایا جہاں پایا

جہاں کا آئینہ تھا اور عیاں گردِ کدورت تھی
نہ عکسِ بزمِ قدرت تھا نہ تصویرِ بشاشت تھی

نہ احساسِ راحت ہی تو راحت اسکو کیوں کہئے
ہو وہ بھی ایک شکلِ غم جو سچ کہئے تو یوں کہئے

سکونِ دل اگر دولت کمانے سے نہ حاصل ہو
تو اس سودے کو سر میں ایک اندازِ جنوں کہئے

شرابِ مدعا بھی گر ہمیں بے کیف رکھتی ہو
تو اسکو ساغرِ دل میں تمناؤں کا خوں کہئے

تبسم عارضی ہی ہے لبِ غنچہ میں تو اس کو
گلستاں میں نسیمِ صبح گاہی کا فسوں کہئے

مسرت وہ ہے جس سے ہو حیاتِ جاوداں پیدا
نہ ہو کلفت کی آمیزش نہ ہو غم کا نشاں پیدا

مبارک ہو وہ کیفیت جو دل کو شادماں رکھے
مبارک ہو وہ خاموشی جو اندازِ بیاں رکھے

غنیمت ہے وہ جذبہ جو بنا دے محو انساں کو
نہ اسکو مضطرب رکھے نہ سرگرمِ فغاں رکھے

ہے اچھا وہ تصور جو محبت سے نمو پا کر
بھلا ہو لا تمناؤں کا دل میں گلستاں رکھے

ہے بہتر وہ شرارِ شوق جو ہنگامِ یاس و غم
شعاعِ مہر بنکر گوشۂ دل ضوفشاں رکھے

وہ خندہ خوب جس سے غنچہ امید کھل جائے
وہ گریہ خوب جس سے گوہر مقصود مل جائے

مسلکِ تسلیم

مطربۂ خوش گلو کمسن و رنگین ادا
عربدہ جو خوبرو عشوہ گر و فتنہ زا
دستِ حنائی میں اک ساغر صہبا لئے
محفل رنداں میں کل یوں ہوئی نغمہ سرا
خرّم و دل شاد ہو رنج و الم تا کجا!

واقف راز جہاں کون ہوا آج تک؟
ساحلِ بحر بقا کس کو ملا آج تک؟
معرفت ذات حق کس کو میسر ہوئی؟
پردۂ بیگانگی اُٹھ نہ سکا آج تک!
عقدۂ ہستی کو حل کس نے کیا آج تک؟

چرخ کے سیّاروں کی دید ہوئی یاس خیز
پائے نظر سے کہیں انکی تھی رفتار تیز
فرش سے ہی عرش تک گلکدۂ کائنات
اپنا کرہ اس میں ہی صورت گل مشک بیز
جیسے ہو اک قطرہ میں عکس چمن جلوہ ریز

ذرۂ ناچیز کی ہوتی تو ہے کچھ نمود
اس سی کہیں کم ہے آہ دہر میں اپنا وجود
تیری حقیقت ہی کیا اور ہے کیا اختیار
بند الم سے نکل اس سی نہیں کوئی سود
بندۂ تسلیم بن اور ہو وقف سجود

دل کی دُنیا

کسی نے برق[1] کو دیکھا ہے موجِ دریا میں — کسی کو لطفِ بیاباں ملا ہے مینا[2] میں
کسی نے سینۂ اخگر[3] میں فصلِ گل دیکھی — کسی نے غلّہ[4] کے خرمن میں موجِ مُل دیکھی
کسی کو پنبہ میں ملبوس کارخانے ملے — کسی کو برگ[5] پہ مطبوعہ کچھ فسانے ملے
کسی نے طور کے پردے کو بھی اٹھا دیکھا — مگر یہ دیکھنے والے سے پوچھو کیا دیکھا
کسی کی قلب کے گنجینے پر نظر نہ ہوئی — نہاں تھے اس میں بھی جوہر مگر خبر نہ ہوئی

ترانۂ بیخودی

اے ہم نفس آ دہر کو خم خانہ بنا دیں — اور گنبدِ افلاک کو پیمانہ بنا دیں
لا گوشۂ عقبیٰ کو بھی دنیا سے ملا لیں — اور عشقِ جنوں ساز کا ویرانہ بنا دیں
بیتابیٔ دل حسن کی تنویر سے چمکائیں — ہم شمع کی لَو کو پرِ پروانہ بنا دیں
گنجینۂ تاریخ ہے ہر ذرۂ عالم — ہر ذرۂ عالم کا اک افسانہ بنا دیں
افلاس و امارت کا یہ جھگڑا ہی چکا دیں — معمورۂ آفاق کو صحرا نہ بنا دیں!
یہ بت تو ہیں پتھر کے نہ بولیں نہ بلائیں — انسان کے شایاں کوئی بت خانہ بنا دیں
اس ہوش ربا حسن کا اک جلوہ دکھا کر — اس واعظِ فرزانہ کو دیوانہ بنا دیں

---

[1] پانی سے بجلی بنتی ہے [2] ریت سے شیشہ بنتا ہے [3] کوئلہ سے رنگ نکالے جاتے ہیں
[4] غلہ سے شراب بنتی ہے [5] پتوں سے کاغذ بنایا جاتا ہے۔

وارداتِ قلب

طوفانِ غم کا سینۂ سوزاں میں جوش ہے
چشم پُرآب قلزم گوہر فروش ہے

ماتم کدے میں شمع کو دیتا ہوں درسِ نطق
سوز و گداز موجب جوش و خروش ہے

فرطِ الم سے لاکھ میں وارفتہ ہوں تو کیا
احساس ہوش رفتہ کا کچھ پھر بھی ہوش ہے

گنجینۂ جہاں ہے بظاہر نظر فریب
عبرت متاعِ آشتی چشم و گوش ہے

کرتا تھا پہلے شکوۂ غمازی نسیم
اب دیکھتا ہوں شاخِ چمن گلفروش ہے

کیوں کر ہو دامن گل صد چاک کا علاج
گلشن میں عندلیب ہی اب عیب پوش ہے

زاہد بہ سبحہ بندۂ تزویر حرص و آز
واعظ بہ پندِ حق و صداقت فروش ہے

محمودؔ ساز غیرت ملّت کو کیا ہوا
ہر چند چھیڑتا ہوں مگر یہ خموش ہے

احساسات

مجھے کشور کشاؤں کی ہوس رانی سے کیا مطلب
میں اپنی کائنات قلب کو تسخیر کرتا ہوں

کبھی اس میں امیدوں کے نئے گلشن اُگاتا ہوں
کبھی ماضی کے بوسیدہ کھنڈر تعمیر کرتا ہوں

جو ابر معصیت سے کچھ فضا تاریک ہوتی ہے
تو اس کو جلوۂ ایماں سے پُر تنویر کرتا ہوں

اگر قسمت پہ شاکر ہوں تو "ناکارہ" ٹھہرتا ہوں
مشیئت سے میں ٹکراتا ہوں گر تدبیر کرتا ہوں
ہوا جاتا ہے پردہ چاک قدرت کے طلسموں کا
جو رازِ ہستیٔ موہوم کی تفسیر کرتا ہوں

فریبِ اُمید

کنجِ غم میں آہ کوئی بھی نہ ہم آواز تھا
ہم نفس تھا گر تو اک تارِ نفس کا ساز تھا
دل میں کچھ اجزائے احساسات پیوستہ ہوئے
پھول جو بکھرے پڑے تھے مل کے گلدستہ ہوئے
کھڑکیاں آنکھوں کی جب مژگاں کی چلمن میں چھپیں
نیند آئی پتلیاں غفلت کے دامن میں چھپیں
قلب میں الفت نے کی آراستہ بزمِ خیال
جس میں روشن کی کسی محبوب کی شمع جمال
جلوہ ہائے حسن کا ساماں تھا اسکے اردگرد
شوق پروانہ صفت رقصاں تھا اسکے اردگرد
آئی امید اور کچھ پیغام لائی بزم میں
بادۂ عشرت سے بھر کر جام لائی بزم میں
ٹھوکروں سے یاس کی لاشے کو ٹھکراتی ہوئی
ہر قدم پر کچھ نہ کچھ اعجاز دکھلاتی ہوئی
دل کے آئینے سے یہ زنگ الم کھونے لگی
اپنے سیمابی رنگوں سے پھر اسے دھونے لگی
جس طرف نکلی نسیم روح پرور کی طرح
کھِل گئے حسرت کے غنچے بھی گلِ تر کی طرح
اس کے غمزے میرے سادہ دل کو بہلانے لگے
اپنے ایّام مسرّت مجھ کو یاد آنے لگے
درد اٹھا نالے سوئے چرخ بریں جانے لگے
اشک تر آنکھوں سے چہرے کی طرف آنے لگے
زخم دل نے دیکھ کر گلکاریاں اُمید کی
یوں کہا ہنس کر یہ تھیں عیّاریاں امید کی

حیات

آہ اک جلوۂ سراب ہے تو
بزمِ ہستی کا ایک خواب ہے تو

موجِ لرزاں ہے، شمع گریاں ہے
آہ سوزاں ہے، اشک غلطاں ہے

برق تاباں ہے، بادِ صرصر ہے
تو شرر ہے، لہو کا جوہر ہے

تیر ہے تو کماں سے چھوٹا ہوا
یا ستارہ فلک سے ٹوٹا ہوا

اشکِ شبنم کی آب و تاب ہے تو
مرغِ بسمل کا اضطراب ہے تو

صحنِ گلشن میں تو کلی کی چٹک
نغمہ قمری کا بلبلوں کی چہک

عارضِ یار کی جھلک میں عیاں
اور لبوں پر تبسّم پنہاں

قہقہہ ہے گلوئے مینا میں
رقصِ مردم ہے چشمِ بینا میں

بحرِ جاوید کا حباب ہے تو
آہ! کیا عارضی حجاب ہے تو

مدارجِ حیات

عدم سے محفلِ امکاں میں جب انسان آتا ہے
وہ اپنے ساتھ اپنی فطرتِ معصوم لاتا ہے

وہ طفلی میں دکھاتا ہے ادائیں دل رُبائی کی
تبسّم داستاں ہوتا ہے اس کی آشنائی کی

زبان حال سے کرتا ہے شکوے کم نگاہی کے
دکھاتا ہے کرشمے بے بسی کے بے گناہی کے

کرم کرتا ہے اپنی مادر اندوہ گیں پر وہ
قدم رکھتا ہے گہوارے سے جب فرشِ زمیں پر وہ

غرض وہ بیٹھتا ہے، بیٹھ کر اُٹھتا ہے، چلتا ہے
وہ چل کر دو قدم پھر ڈگمگاتا ہے، سنبھلتا ہے

گزر جاتا ہے جب یہ دور پھر تعلیم پاتا ہے
بغل میں لے کے چھوٹی سی کتاب اسکول جاتا ہے

معلّم کی نظر آتی ہیں جب کچھ خشمگیں آنکھیں
چھپا لیتا ہے ڈر کر اپنی زیرِ آستیں آنکھیں

اگر اٹکھیلیوں میں مدرسے کا دھیان آتا ہے
لبوں پر جان آتی ہے، دل اس کا سہم جاتا ہے

مگر فطرت میں رہتے ہیں وہی انداز جانبازی
ادا و غمزہ و شوخی حیا و ناز و طنازی

وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر جب نکلتا ہے
تو پھر عہدِ شباب اس کا نیا قالب بدلتا ہے

امنگیں دل میں پاتا ہے نئی اُٹھتی جوانی کی
ہوس ہوتی ہے رہ رہ کر اب اس کو نغمہ خوانی کی

نگاہِ شوق میں اک حسن کی تصویر پھرتی ہے
اور اس میں زلف پیچاں صورت زنجیر پھرتی ہے
نگاہوں سے کسی کی اب نگاہیں اس کی لڑتی ہیں
کہیں پر بے محابا اور کہیں دزدیدہ پڑتی ہیں
کبھی شیون کبھی آہیں کبھی فریاد کرتا ہے
اگر موقع نہیں ملتا تو دل میں یاد کرتا ہے
وہ جذبہ صورت آتش چمکتا ہے جو چہرے سے
فروزاں اور ہو جاتا ہے وہ شادی کے سہرے سے
بدل دیتی ہے اب فطرت شریک زندگی اس کی
خوشی میں اس کی ہو جاتی ہر اکثر ضم خوشی اس کی
اگر اولاد ہوتی ہے تو کچھ دلشاد رہتا ہے
کبھی خود ناز کرتا تھا اب اس کے ناز سہتا ہے
بصارت کا تحفظ شیشۂ عینک سے کرتا ہے
اور اپنی جامہ زیبی کے لئے گھنٹوں سنورتا ہے
یہ مدت بھی گزر جاتی ہے عیش زندگانی پر
خلش پر، فکر پر، اشغال پر، رنگیں بیانی پر
اب اس کے بعد آتی ہے صعوبت عہد پیری کی
وہ ضعف تن سے ہو جاتا ہے اک تصویر اسیری کی

نہ اب وہ ولولے دل میں نہ وہ شوقِ خود آرائی
جوانی لے گئی ہمراہ اپنے اپنی زیبائی
دہن میں ہیں دُر دنداں نہ آنکھوں میں ہی بینائی
نہ قوت پائے لرزاں میں نہ ہاتھوں میں توانائی
بنا دیتا ہے فرشِ راہ وہ جسمِ خمیدہ کو
وہ گویا ڈھونڈتا پھرتا ہے اب عمرِ رسیدہ کو
نظر آتی نہیں شکلِ طرب کوئی بھی دنیا میں
وہ پھر دو چار دن جیتا ہے مرنے کی تمنا میں

رہروِ ہستی

حُسنِ گل و لالہ زار رقص کناں جوئبار
شوخیٔ بادِ بہار دل کشیٔ کوہسار
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا
بزم کی زیبائیاں حسن کی رعنائیاں
عشق کی رُسوائیاں اور جبیں سائیاں
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا
خانۂ خمار کو ساغرِ سرشار کو
بادۂ گلنار کو رند کو۔ میخوار کو

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مفلس بے کار کو بکیس و ناچار کو
مُسرف بدکار کو مال کے انبار کو

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

حضرت واعظ کا رنگ وسعت تخئیل تنگ
جملہ مذاہب سے جنگ طرفہ کمانے کے ڈھنگ

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مسلکِ صوفی کے راز نکتۂ عرفاں نواز
قول حقیقت طراز فعل میں رنگ مجاز

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

بسمل ناکام کو قاتل بدنام کو
خنجر و صمصام کو قتل کے انجام کو

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

تاجور دل فگار مضمحل و اشک بار
تخت جواہر نگار عسکر ہمت شعار

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

حالت بیمارِ غم آنسوؤں سے چشم نم
نبض کی رفتار کم آیا ہوا لب پہ دم

یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مجمع حیرت فروش میّت بیکس بدوش
بے خبر عقل و ہوش چشم تر و لب خموش
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

گوشۂ نادیدہ کو سبزۂ روئیدہ کو
مرقدِ بوسیدہ کو میّت خوابیدہ کو
کونے میں بیٹھا ہوا یاس سے تکتا رہا

رازِ ہستی

نسیمِ صبح کی عنبر فشانیاں دیکھیں تو آہ بھر کے کہا غنچۂ گلستاں نے
کیا تھا جمع جو سرمایۂ شمیم اب تک نہ کی بہار میں قدر اس کی میری داماں نے
لٹا دیا اُسے گلشن میں جان کر بے سود چھپا لیا اُسے آغوش میں بیاباں نے

زمینِ دشت کے کانٹے مری نصیب میں تھے جواب بھی دامنِ صد چاک میں نمایاں ہیں
یہی سبب ہے کہ گلزار ہو گئے تاراج شمیمِ گل سے معطر، بہت بیاباں ہیں
بکھر گیا ہے جو شیرازہ حیات اپنا فنا کے خوف سے اوراق سب پریشاں ہیں

لمحۂ درس

ہجوم یاس نے مغموم کر دیا تھا مجھے متاعِ عیش سے محروم کر دیا تھا مجھے

وفورِ گریہ سے دل خون ہو کے بہتا تھا — میں سر جھکائے عجب غمزدہ سا رہتا تھا
نہ دل میں عزم، نہ جرأت نہ ولولہ نہ خروش — پڑا تھا گوشۂ ویراں میں جیسے خانہ بدوش
سمجھ رہا تھا کہ آہ و بکا بجا ہے مری — کہ غم ازل ہی سے تقدیر میں لکھا ہے مری
غرض فسردہ و حیران و اشک بار تھا میں — تباہ حال و پریشاں و دل فگار تھا میں
جو روتے روتے مری چشم اشک بار اٹھی — لبِ خموش سے اک آہ بے قرار اُٹھی
میں دیکھتا ہوں کہ اک مورِ ناتواں و زار — دہن میں پکڑے ہوئے ایک نیم مردہ شکار
شجر پہ چڑھتی ہے دو چار ہاتھ گرتی ہے — تلاشِ صید میں پھر بے قرار پھرتی ہے
وہ حجم و وزن میں اس سے کئی گنا تھا شکار — اور اس کے جسم پہ بھی کچھ پڑا ہوا تھا غبار
مگر وہ مورِ ضعیف اس کو آگے لے کے بڑھی — ہزار بار گری اور ہزار بار چڑھی
وہ یوں تو کہنے کو تھی ایک مورِ بے مایہ — مگر مرے لئے تھی وہ خضر کا ہم پایہ
اُسی نے راہ سجھائی تھی جستجو کی مجھے — اُسی نے شرح بتائی تھی آرزو کی مجھے
اُسی نے عزم دیا تھا دلِ شکستہ کو — اُسی نے یاد دلایا تھا عیشِ رفتہ کو
اُسی نے جادۂ مقصد پہ گامزن کر کے — اُسی نے قالبِ مردہ میں زندگی بھر کے
مجھے زمانے کے چھوٹے نشیب دکھلائے — کم ہمتی کے انوکھے فریب دکھلائے

برکاتِ ستم

جفاؤں کے کرشمے بھی سبق آموزِ عبرت ہیں
یہاں اسبابِ پستی بھی دلیلِ اوج و رفعت ہیں

نکلتا ہے گہر بطن صدف جب چاک ہوتا ہے
وہ تخم اُگتا ہے جو گل کر زمیں میں خاک ہوتا ہے

لگاتا ہے قلم جب باغباں شاخ بُریدہ پر
تو پھر وہ شاخ ناکارہ دکھاتی ہے نئے جوہر
شجر میں طاقت آتی ہے جو کلیاں توڑی جاتی ہیں
جو شاخیں پھیل جاتی ہیں وہ آخر موڑی جاتی ہیں

جو کوئی موج دریا کی روانی روک دیتا ہے
تو وہ سیلاب اُٹھتا ہے کہ جاں لوگوں کی لیتا ہے
رگڑ ہی معدنی اشیا پر آب و تاب لاتی ہے
زبانِ تیغ پتھر چاٹ کر جوہر دکھاتی ہے

رہے ہیں سرزمینِ مصر میں یوسفؑ بھی زندانی
غلامی اور اسیری ہی نے بخشا تاجِ سلطانی
جو سچ پوچھو تو اپنا کشتۂ تیغ جفا ہونا
ہے گویا مدعائے ارتقا سے آشنا ہونا

ستم کی داستانیں بابِ حریّت کا عنواں ہیں
غبارِ کشتگاں میں ذرّہ ذرّہ ہمت فروزاں ہیں

تلقینِ ہمسفر

راہ تری پر خطر
تنگ بساطِ نظر
یاس کا دل میں گزر
وقت شبِ تار ہے
ہار نہ ہمت مگر
کیوں ہے ہراساں اگر دور ہے منزل تری
ولولۂ دل نیا
اور تو غافل نیا
منظرِ ساحل نیا
میں تو نہیں ہوں مگر
رہبرِ منزل نیا
کیوں ہے ہراساں اگر دُور ہے منزل تری
کیوں ہے گرفتارِ غم
دیکھ یہ نقشِ قدم
پڑتے ہیں جو دم بدم
دشت میں آج اک نئی

راہ بناتے ہیں ہم

کیوں ہے ہراساں اگر دور ہے منزل تری

مُڑ کے مری جاں نہ دیکھ

حدِّ بیاباں نہ دیکھ

خارِ مغیلاں نہ دیکھ

عزم کی قوت دکھا

ہو کے پریشاں نہ دیکھ

کیوں ہے ہراساں اگر دور ہے منزل تری

روح کو بیدار کر

طالبِ آزار کر

نفس سے پیکار کر

آنکھ کی عینک بدل

دشت کو گلزار کر

کیوں ہے ہراساں اگر دور ہے منزل تری

نگاہِ شوق

دونوں جہاں کی خلق پہ اس لیے تجھ کو فوق ہے

تیرے گلے میں بندگی کا بھی ازل سے طوق ہے

انس ہے کائنات سے عقل ہے اور ذوق ہے
عقدہ کشا رموز کی تیری نگاہ شوق ہے

دیکھ فضا میں آفتاب آئینہ حیات ہے
گردش مستقل یہاں اک سبب ثبات ہے
عالم جد و جہد اک ذرّہ کائنات ہے
عقدہ کشا رموز کی تیری نگاہ شوق ہے

موج رواں میں ہیں شرر برق تپاں کے عکس ریز
قطرۂ آب میں نہاں طاقت اسپ تند و تیز
نکہت گل سے تخم کا سینۂ تنگ مشک بیز
عقدہ کشا رموز کی تیری نگاہ شوق ہے

مشت غبارِ دشت میں بند شعاع آفتاب
اور فضائے دہر میں قید ہے نغمۂ رباب
نخل چمن کے برگ کا ہر ورق اک نئی کتاب
عقدہ کشا رموز کی تیری نگاہ شوق ہے

زندگیِ مُستعار

کتنا ہے یہ تیز گام ابلق لیل و نہار
اُڑ رہا ہے مہر کا جلوہ مثال غبار

چال نہیں استوار، رنگ نہیں پائیدار
اس ہی کی گردش سے ہے عمر کا اپنی شمار
زندگیِ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار

علم و ہنر حُسن و عشق کس پر کریں التفات
ان کو ہے درکار وقت، ان کو ہے لازم ثبات
لمحوں کی موجوں سے پُر چشمۂ ایام زیست
پھر وہ رواں مثلِ برق کیا کرے ناکام زیست
زندگیِ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار

باغ تخیّل میں گر پھول شگفتہ ہوا
دامن نسیاں میں وہ جا کے نہفتہ ہوا
دیکھتے ہی دیکھتے اُڑ گئی بوئے چمن
نخل تھے بے برگ و بار خشک تھی جُوئے چمن
زندگیِ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار

کیا نہ کریں کیا کریں غور کی مہلت کہاں
بہہ رہے ہیں دہر میں صورتِ موجِ رواں
زیست کا ہر واقعہ قلب کو گرماتا ہے
قلزمِ ماضی میں موج بن کے وہ بہہ جاتا ہے
زندگیِ مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار

قومیں اُبھرتی ہیں اور رہ کے فنا ہوتی ہیں
سنگِ حوادث کی ضرب سہہ کے فنا ہوتی ہیں
ذرّوں سے گیتی کے چُن آئینہ ہائے زوال
ان میں نظر آئیں گے مدفن جاہ و جلال
زندگی مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار

نغمۂ شیریں کی روح شعر کے قالب کو دے
جام مئے جستجو زیست کے طالب کو دے
تیشۂ ہمت اُٹھا سنگ تساہل پہ مار
کرلے جو کرنا ہے آج کل کا کسے اعتبار
زندگی مستعار کو نہیں کچھ بھی قرار

دنیائے عمل

پیشانی فلک پہ تھے موتی جڑے ہوئے
رخسار شب پہ گیسوئے مشکیں پڑے ہوئے
اُلٹا نہ تھا کتاب جہاں کا ابھی ورق
مشرق کے لالہ زار سے پھولی نہ تھی شفق
گردوں پہ تھا گلاب نہ پتی گلاب کی
یعنی تھا آفتاب نہ ضو آفتاب کی
موجیں اُبل رہی تھیں قمر سے جو نور کی
آتی تھی کائنات نظر اس میں دُور کی
وہ کائنات جسکی لطافت تھی بے نظیر
خلد بریں کا جس کے عناصر میں تھا خمیر
ہر وقت جس کی گرمی بازار تھی نئی
ہر لمحہ جس کی رونق گلزار تھی نئی

برق عمل نے رات کو بخشا تھا حسنِ روز
اور دل میں بھر دیا تھا عجب زندگی کا نور

شائق تھا ہر دماغ عروج و نمود کا
باقی نہ تھا نشان بھی جہل و جمود کا

دل میں تھا جوش اور بلندی خیال میں
ہر فرد اس جہاں کا تھا یکتا کمال میں

سیرت میں علم و فن کے جواہر بھرے ہوئے
دل کے صدف میں گوہر نادر بھرے ہوئے

تھے پختہ اُن کے تجربے اور پختہ انکے عزم
اور منضبط تھے پہلے سے اوقات رزم و بزم

ہمدرد۔ علم دوست، مخیّر، وطن نواز
خوش خلق، و بے تعصب و بے لوث و کارساز

گردوں حقیر و پست تھا ان کی نگاہ میں
ٹھکرائیں کوہ کو بھی اگر آئے راہ میں

معمور تھا حقائقِ قدرت سے ہر دماغ
موج ہوا سے لیتے تھے وہ جلوۂ چراغ

اوراقِ گل کو جمع کریں بوستاں سے
پتوں کی داستاں سنیں انکی زباں سے

صحرا کے ذرّے ذرّے کو پہچانتے تھے وہ
اس کو گہر سے بیش بہا جانتے تھے وہ

تزئیں تھی اس زمیں کی پرستان کی طرح
قابض تھے وہ ہوا پہ سلیمان کی طرح

تابندہ رخ ہی دیکھتے تھے وہ جہاں کا
کانٹا بھی ان کو پھول تھا اس بوستاں کا

حیرت سے دیکھتا تھا میں اس کائنات کو
رونق یہ تھی کہ دن میں سمجھتا تھا رات کو

عالم نے اپنے چہرے سے اُلٹا نقاب کو
چمکا یا اپنے آئینہ آفتاب کو

چونکایا مجھ کو خواب سے اسکے جمال نے
یہ عکسِ خواب کھینچا ہے میرے خیال نے

زمانے کا پیغام

زندہ کرتا ہی رہا دنیا کو ہر دن آفتاب
دن پلٹتے ہی رہے ہم شکل اوراقِ کتاب

آبشاروں سے نئے نغمے نکلتے ہی رہے
اور دریا اپنی تحریریں بدلتے ہی رہے

بحر کے سانچوں میں تیغ موج ڈھلتی ہی رہی
اور حبابوں کی کٹوری بھی پگھلتی ہی رہی

دست صحرا اپنے ٹیلے منتقل کرتا رہا
اور غباروں میں بگولا اپنا دم بھرتا رہا

صحن عالم کچھ نئے گلشن کھلاتا ہی رہا
اور ہر گلشن نئی خوشبو سنگھاتا ہی رہا

چرخ پر کلک شفق کرتی رہی نقش و نگار
اور دکھاتی ہی رہی ہر لحظہ تازہ شاہکار

تیرے دل کی سطح پر خاکہ جو اک بوسیدہ ہے
سخت حیرت ہے کہ ابتک اس کا تو گرویدہ ہے

ارتقا

دہر کے ذرے نمو کے واسطے بیتاب ہیں
چشم عالم سے نہاں لاکھوں ابھی مہتاب ہیں

نخل کے ہر خلیہ میں پنہاں ہے سامان حیات
سیکڑوں عالم دکھائے گی ابھی یہ کائنات

ہیں فضا کے پردۂ رنگیں پہ لاکھوں گلستاں
آج تک مرغ تخیل بھی نہیں پہنچا جہاں

دیدۂ عالم سے ان کی تابشیں مستور ہیں
ان کی نکہت سے عدم کی گھاٹیاں معمور ہیں

دیکھتا ہوں ان کے نقش آئینہ ایام میں
سوئے مشرق وہ چمکتے ہیں شفق کے جام میں

اس جہاں کے ذرہ ذرہ میں جہاں آباد ہے
تخم کے سینے میں خوابیدہ تن شمشاد ہے

دہر رقصاں عقل انسانی کا اک گہوارہ ہے
عقل انسانی فضائے دہر کا طیارہ ہے

توانائی

(رڈیارڈ کپلنگ کی نظم سے ماخوذ ہے)

یہ میخواروں سے کل سرگوشیاں کرتا رہا ساقی / کہ اقوام سلف کے اب نشاں تک بھی نہیں باقی
مگر تاریخ سے ظاہر ہے اسکی علتِ غائی / یہاں وہ زندہ رہ سکتا ہی جسمیں ہو توانائی
اگر اس بزم گیتی میں تمھیں جینا جلانا ہو / ضروری ہی کہ پھر ہر ناقص و کامل توانا ہو
ہوا کیا گر کسی میں ہیں بھی کچھ امراض جسمانی / کہ کھو دیتی ہے جسمانی نقائص عقل انسانی
وہ اگلے جلوہ ہائے عقل و دل اب بھی ہویدا ہیں / دیئے مٹی کے ہیں جن سی شرار طور پیدا ہیں
دکھاؤ تم بھی جوہر اپنا جو تم کو دکھانا ہو / مگر یہ شرط ہے پہلے تمھارا دل توانا ہو
ہوا کیا گر نہیں ہے کچھ بشاشت طبع مردہ میں / توانا جسم سے آتی ہی جاں روحِ فسردہ میں
اسی گوشے میں برقِ حسن آکر جگمگاتی ہے / اسی قالب میں شمشیر شجاعت ڈھالی جاتی ہی
اگر قلب حزیں سے یاس کا عالم مٹانا ہو / تو لازم ہی تمھارا جسم موزوں اور توانا ہو
توانا دل توانا جسم ہی انساں کے جوہر ہیں / یہی اخلاق کے مخزن یہی خوبی کے مظہر ہیں
انہی سے آب جاتی ہی دانش کے نگینوں میں / درخشاں تھے یہی جوہر تو سب مسند نشینوں میں
بزرگانِ سلف کا ساتھیں گر اوج پانا ہو / تو پھر اس عالم اسباب میں تم سب توانا ہو
فنوں سی، نعمتوں سی، حسن کی دلکش اداؤں سی / زر و شہرت سی، دولت سی، مناظر سی، فضاؤں سی
علوم دنیوی سے بھی تلافی ہو نہیں سکتی / مقابل اسکے کوئی شی بھی کافی ہو نہیں سکتی
کوئی قانون ہے ایسا نہ جس نے اسکو مانا ہو / کہ دل اور جسم انساں کا بہر صورت توانا ہو

فضیلت سے زیادہ جنکی اب ہمکو ضرورت ہی   سکوں پرور دماغ اور وہ دل پاکیزہ طینت ہی
نگاہ نکتہ رس جو جنبش انگشت پا سمجھے   وہ روح زندہ جو ہر رنج کو راحت فزا سمجھے
اگران سب کو اپنی قبضۂ قدرت میں لاناہو   توانا ہو۔ توانا ہو۔ توانا ہو - توانا ہو

سیلِ زمانہ

یونہی یہ سیل زمانہ مجھے بہائے جائے
دل ملول سے نقش الم مٹائے جائے
نویدِ اوج، سرودِ ظفر سنائے جائے
مرے خیال مری ہمتیں بڑھائے جائے
نئی زمین نئے آسماں دکھائے جائے

نہ کوئی روزِ ازل کا سراغ پاتا ہے
رخ ابد سے نہ پردہ کوئی اُٹھاتا ہے
کسی سے پوچھ کے دیکھو تو کیا بتاتا ہے؟
کہاں سے آیا ہے تو اور کدھر کو جاتا ہے؟
مگر یہی کہ وہ سُن سُن کے مسکرائے جائے

کسے خبر ہے کہ ہستی کا مدعا کیا ہے
فنا کا سلسلہ یہ کیوں ہے، اور بقا کیا ہے؟
یہ مہر و ماہ میں گردش میں کیوں؟ ضیا کیا ہی؟

یہ وقت کیا ہے؟ فلک کیا ہے اور فضا کیا ہے؟
مگر جو چاہے وہ بیٹھا تکیں ملائے جائے
وہ ڈوبے سیلِ زمانہ میں کیا کنارے جائے
بشر کا کام ہے بس ہاتھ پاؤں مارے جائے
جو موجیں تند ہوں تو اور سر اُبھارے جائے
وہ اپنے جسم کو ہاتھوں کے بل سہارے جائے
مصیبتوں میں ہنسے آپ اور ہنسائے جائے

رازِ بقا

کسی نے فصلِ گل میں جا کے پوچھا خاکِ گلشن سے
ہوائے مشک بیز اُڑنے لگی پھر تیرے دامن سے
پھر آئے ابر کے جھونکے تجھے شاداب کرنے کو
گیاہِ سبز اُٹھی پھر بسترِ کمخواب کرنے کو
ترے دامن سے پھر اٹکھیلیاں کرتی صبا نکلی
شگوفے کے دہن سے اک صدائے دلکشا نکلی
دُرِ شبنم نے پھر اوراقِ گل پر تارے چمکائے
اور ان تاروں میں لاکھوں عکسِ ماہِ دمہ نظر آئے

فضا میں چہچے گونجے ہیں ترے نغمہ خوانوں کے
چنے جانے لگے شاخوں پہ تنکے آشیانوں کے
عجب حیرت فزا ہے یوں ترا آباد ہو جانا
خزاں آتے ہی پھر پژمردہ و برباد ہو جانا!
بنا ہے حسن کیا دنیا میں یوں مٹنے مٹانے کو؟
یہ کیا اک محض دھوکا ہے ہمیں احمق بنانے کو؟
یہ سن کر گوشۂ گلشن سے دھیمی سی صدا آئی
کہ نو وارد ہے تو اے بزم قدرت کے تماشائی
نہیں دیکھا ہے اس عبرت کدے کو بے خبر تو نے
نہیں کی ہے یہاں کے ذرّے ذرّے پر نظر تو نے
بقا ہستی کی پوشیدہ ہے اس مٹنے مٹانے میں
کہ آئین تغیّر کار فرما ہے زمانے میں

شاعر

سکوتِ شب میں دنیا اپنے گیسو کھول لیتی ہے
مری فکر رسا فطرت کے موتی رول لیتی ہے
وہ ہر موتی کو میزان خرد میں تول لیتی ہے
میں پھر سلک سخن کو ان سے پُر تنویر کرتا ہوں

میں قدرت کے لب خاموش سے اسرار سن کر
گل و بلبل سے حسن و عشق کی گفتار سُن سُن کر
زبان شمع سے فریاد آتش بار سُن سُن کر
حدیثِ دہر کی اشعار میں تفسیر کرتا ہوں

کبھی جھنجھلا کے میں قید مذاہب توڑ دیتا ہوں
میں حق سے بندگانِ حق کا رشتہ جوڑ دیتا ہوں
صنم خانے میں آجاتا ہوں مسجد چھوڑ دیتا ہوں
ریاکاروں کی بھر دل کھول کر تحقیر کرتا ہوں

یہ میری چشم تر دامانِ عصیاں پاک کرتی ہے
مری نوکِ نظر ہستی کا پردہ چاک کرتی ہے
یہ برق حسن جب دل کو جلا کر خاک کرتی ہے
اسی پر خانۂ الفت کو پھر تعمیر کرتا ہوں

جہاں میں جس جگہ سنتا ہوں میرا ہی فسانہ ہے
بصیرت ہی مری عنوانِ روداد زمانہ ہے
میں ہی مقصود اصلی ہوں مجھی کو آزمانا ہے
رموزِ منظر قدرت میں ہی تحریر کرتا ہوں

میں شاعر ہوں مری عظمت کا سکّہ بام و در پر ہے
ہوا پر آسماں پر لامکاں پر بحر و بر پر ہے

مجھے ناز اپنے دل پر ذہن پر اپنے ہنر پر ہے
میں اپنی نوک خامہ سے جہاں تسخیر کرتا ہوں

تاج شاہی کا شکستہ نگینہ

معدنِ الماس سے کیا سرخ رو آیا تھا تو
مہر عالم تاب سے تابندگی لایا تھا تو

تیری ہستی ہی تھی باغ ارجمندی کی بہار
فخر و جاہ و تمکنت کا تو ہی تھا آئینہ دار

ایک عالم سرنگوں ہوتا تھا تیرے سامنے
کیسا حریت کا خوں ہوتا تھا تیرے سامنے!

اللہ اللہ کوئی تاب دید لا سکتا نہ تھا
اختر تابندہ بھی یہ رتبہ پا سکتا نہ تھا

لیکن اب بے آب ہے اک ریزۂ گل طرح
تیرہ و تاریک ہے اُجڑے ہوئے دل کی طرح

دست قدرت پھر اُچھالیگا تجھے اس خاک سے
اب ترا پندار ٹوٹا صحبت خاشاک سے

خاک آلودہ جو تیرا دیدۂ پُرنور ہے
میں سمجھتا ہوں کہ یہ مردہ چراغِ طور ہے

اے نگیں تیری طرح ہے دہر میں انساں کا حال
اوج کے آئینہ میں تکتا ہے یہ اپنا زوال

رفتہ رفتہ پست ہو کر ذلتیں سہتا ہے یہ
جستجوئے اوج میں پھر مضطرب رہتا ہے یہ

شکوۂ شمع

شمع کہتی تھی یہ پروانے سے گریاں ہو کر
تو نے کچھ بھی نہ کیا سوختہ ساماں ہو کر

قطرے شبنم کے بنے زینت پیشانیِ گل
وہ مٹے بھی تو مٹے گوہر تاباں ہو کر

گل نے بخشا تو سہی حُسنِ گلستاں کو فروغ
اور مرجھایا بھی ٹہنی پہ تو خنداں ہو کر

یوں تو خود ہی تھا وہ گلشن کیلئے وجہ نشاط — دل کشی بڑھ گئی کچھ اور پریشاں ہو کر
نکہتِ غنچہ نے توڑیں تو خموشی کی قیود — ہدفِ کشمکشِ تنگیِ داماں ہو کر
بلبلِ زار نے سکھلائی تو الفت کے رموز — اک خزاں دیدہ گلستاں میں غزلخواں ہو کر
چشمِ عشاق نے برسائی تو کچھ اشک کے پھول — رنگ تو لائی وہ کچھ زینتِ داماں ہو کر
اہلِ محفل کیلئے کیا کیا ناداں تو نے — تو، کہ آیا تھا وہاں شعلۂ عریاں ہو کر!
تشنۂ ذوق رہی گرمیِ محفل تجھ سے — نہ گرا بزم پہ تو برقِ فروزاں ہو کر
سوزشِ عشق نے تاثیر دکھائی معکوس — تو نے ظالم مجھے گل کر دیا رقصاں ہو کر

فطرتِ مسلم

کسی نے شاعرِ فطرت شناس سے یہ کہا — فضائے دہر سے اونچی ہی تیری حدِّ تلاش
نچوڑتا ہے مئے ناب تاکِ پروین سے — سجاتا ہے طبقِ مہر میں ہلال کی قاش
تری نگاہ ترحم ہے وقفِ چارہ گری — نہ مندمل ہوئی تجھ سے ہماری دل کی خراش!
شکارِ تیرِ ملامت ہے آج مسلمِ ہند — اور اس کے دین پہ ہنستا ہی مغربی عیاش
زمیں کے ذرّوں سے گلخن کی شان پیدا ہی — ہی اس کی خرمنِ ہستی پہ چرخ صاعقہ پاش
یہ کارزارِ جہاں میں ہی کیسی جنگِ ملل — بجائے تیر و سناں چل رہی ہی کفشِ معاش
اسیرِ پنجۂ سرمایہ ہے کہیں مزدور — بنی ہے لقمۂ آقا کہیں غلام کی لاش
ہیں تنگ فتنۂ آذر سے پیروانِ خلیلؑ — نکالتا ہی شراری بتوں سے سنگ تراش
یہ ڈر ہے بار نہ ہو تیری طبعِ نازک پر — میں ورنہ اور بھی سربستہ راز کرتا فاش

دل حزیں کو ہے تسکین بخش تیرا کلام
ہمارے زخم کا بھی علم تجھ کو ہوتا کاش
یہ سن کے شاعر رمز آشنا نے اس سے کہا
رہے ہیں تیرے سلف بزم دہر میں گلپاش
بدل سکا ہی نہ بدلے گا کوئی فطرت دہر
بن اپنے دل کا محاسب نہ دل میں رکھ پرخاش
"چو غنچہ گرچہ فرو بستگیست کار جہاں"
"تو ہم چو باد بہاری گرہ کشا می باش"

سائنس کے احسانات

انسان علم سائنس کا احسان مند ہے
فرش زمیں سے جسکی فلک تک رسائی ہے
آنکھوں کو خوردبیں سے بصیرت عطا ہوئی
اور دُوربیں نے گم شدہ منزل سجھائی ہے
کانوں کے ٹیلیفون نے پردے اٹھا دیئے
اور ریڈیو نے نطق کی قوت دکھائی ہے
توپوں نے زور پنجۂ انساں بڑھا دیا
ٹینکوں نے اسکی اور بھی عظمت بڑھائی ہے
وہ پاؤں جس کو بادیہ پیمائی عار تھی
زیپلن نے اس کی چال ہوا سے ملائی ہے
بام فلک سے کود کے آتے ہیں پیراشوٹ
تارے سے ٹوٹتے ہیں یہ معجز نمائی ہے
القصہ سائنس ہی کا کرشمہ ہے جس نے آج
انسان کے عضو عضو کی قوت بڑھائی ہے
لیکن یہ علم روح کو پستی میں لے گیا
اس میں اگر برائی ہے تو یہ برائی ہے

مغربی علم و ہنر کا مآل

ہم نے تو یہ سنا تھا علوم جدید سے
مٹ جاتے ہیں نقوش جہالت دماغ سے
یورپ کے رہنے والے مہذب ہیں اور انھیں
علم و ہنر سے اُنس ہی نفرت فراغ سے

لیکن یہ ان کے علم نے کیا گل کھلائے ہیں
چنگاریاں نکلتی ہیں مغرب کے باغ سے

ان خوش نوائیوں کا مگر راز اب کھلا
بلبل کے نغمے سنتے تھے منقارِ زاغ سے

تہذیبِ مغربی کے وہ گلہائے دلفریب
دیکھا جو غور سے تو نظر آئے داغ سے

زہراب تھا صراحیوں میں اسکی مے نہ تھی
دنیا ہلاک ہو گئی دورِ ایاغ سے

اب اپنے جام زہر کا یورپ شکار ہے
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

فلسفۂ مرگ

دایہ کی گود سے روتا ہوا بچہ لے کر
مادرِ مشفقہ سینے سے لگا لیتی ہے
جب نہیں آتا اُسے پہلوئے مادر میں قرار
رحمتِ حق اسے دامن میں چھپا لیتی ہے

موجِ صدا

موجِ صدا جو کان کے پردے پہ جا لگی
اک نغمہ بن گئی وہ ربابِ خیال کا
ہے نغمۂ خیال میں پنہاں عمل کی روح
اور ہر عمل سبب ہے عروج و زوال کا

فلسفۂ حیات و ممات

وہ دل فریب پھول جو تھا رونقِ بہار
ہر دم خزاں کے خوف سے رہتا تھا دلفگار
جس کی نزاکتوں پہ گراں تھا ہوا کا بار

تنگ آ گیا تھا کشمکشِ خوف و بیم سے
وہ ہمکنار ہو گیا موجِ نسیم سے
اور عطر دان بھر دیا اپنی شمیم سے

وہ ساغرِ شراب جو تھا جانِ میکدہ
جس کی جھلک سے بڑھ گئی تھی شان میکدہ
کہتے تھے جس کو مہرِ درخشان میکدہ

جب گردشِ مدام سے مجبور ہو گیا
شیشہ تھا گر کے فرش پہ وہ چور ہو گیا
عالم تمام کیف سے معمور ہو گیا

نا آشنائے فطرتِ بزمِ کہن ہے تو
ناواقفِ شمیمِ گل و نسترن ہے تو
شیدائے دل فریبیٔ رنگِ چمن ہے تو

کرتا ہے کیوں فنا و بقا میں تو امتیاز

کیوں مثلِ شمع رہتا ہے خاموش و دلگداز
نادان ہے فنا ہی میں مضمر بقا کا راز

مرقدِ شہید

کسی شہید کے مرقد پر ایک حاجت مند
چمن کے کچھ گلِ تازہ چڑھانے آیا تھا
چھڑک چھڑک کے عرق اور لگا لگا کر عطر
وہ تشنگیٔ عقیدت بجھانے آیا تھا
دلِ ستم زدہ و اشکبار آنکھوں سے
اُسے فسانۂ کلفت سنانے آیا تھا
چلا وہاں سے تو روحِ شہید کہنے لگی
کہ بے خبر مجھے تو کیوں ستانے آیا تھا
یہ عطر پھول چڑھانے تھے مہ جبینوں کو
میں نازنیں تھا جو مجھ کو سُنگھانے آیا تھا؟
جو لانا ہی تھا تو شمشیرِ تیز دم لاتا
تُو میری روح کو بزدل بنانے آیا تھا!

دولت

آئینہ خورشید سے چمکا رخِ مہتاب
موجیں کششِ مہ سے بنیں ماہیٔ سیماب
موجوں نے خمِ بحر کو اندر سے کھنگالا
اور سیپ کو اک سمت سی اس خُم کے نکالا
اُس سیپ کے پردے سے جو نکلے دُرِ شہوار
دولت کا انھیں سے یہاں قائم ہوا معیار
دولت نے جسے افضل و ممتاز بنایا
دنیا نے اسی تختِ شرافت پہ بٹھایا
دولت ہی تمدن کی بنی آئنہ بردار
دولت ہی سے ہے حسن کی یہ گرمیٔ بازار

دولت ہی سے غارت گری و جنگ و جدل ہے
سرمایۂ عالم کے توازن میں خلل ہے

دولت کی حقیقت؟ صدف و سنگ کے ریزے
دولت میں یہ قدرت کہ وہ دنیا کو بدل دے!!

پردے کا روشن رُخ

فرمایا ایک دوست نے عورت کے باب میں
مردوں کی جان زار ہے اس سے عذاب میں

بدشکل ہے تو موجب دل بستگی نہیں
شوہر کو اسکی ذات سے کوئی خوشی نہیں

گر حُسنِ اتفاق سے وہ دیدہ زیب ہے
گفتار ساحرانہ، ادا دل فریب ہے

وہ اپنے دامِ حسن میں سب کو پھنسائیگی
خاوند کو جہاں کا دشمن بنائے گی

کچھ نام ہی کو حسن ہے گر خدّ و خال میں
اور دلکشی نہیں ہے کچھ ایسی جمال میں

شوہر کو اس سے ہوگا تو کچھ روز التفات
لیکن پھر اس کے بعد نہ پوچھیگا اسکی بات

پائیگا جب کشش ہی نہ اس کے جمال میں
کیا لائیگا پھر اس کو وہ اپنے خیال میں

جاتی رہیں گی دل کی امنگیں رہی سہی
اپنے کیے پہ ہوگا پشیمان آپ ہی

دیکھے گا رہ گزر میں وہ جس گل عذار کو
کردے گا چاک دامن صبر و قرار کو

بدشکل ہوں حسین ہوں کہ خوشرو برائے نام
مردوں کو عورتوں سے اذیت ہی ہے تمام

میں نے یہ عرض کی کہ جو بے پردگی نہ ہو
مردوں کو عورتوں سے کوئی کوفت ہی نہو

حیواں کم خرد میں بھی ہے کچھ نہ کچھ جمال
ان کی ہر ایک مادہ کے یکساں ہیں خدّ و خال

عورت کے حسن میں ہی تنوع مگر جناب
کیونکر پڑے نہ مرد کی پھر چشمِ انتخاب

نیرنگی جمال کو دیکھے اگر نہ مرد — سمجھے وہ اپنی زوجہ ہی کو خوبیوں میں فرد
گر حسنِ خود نما میں یہ آوارگی نہ ہو — بے وجہ دل فگار کوئی آدمی نہ ہو

اسرار نفسیات پہ دیں کی نگاہ ہے
پردہ کی احتیاج پہ فطرت گواہ ہے

ہولناک دورِ جنگ

شفق کے خون میں ڈوبا ہوا ہے مہر مہیب
دہکتے لوہے کی صورت ہیں تیراس کے قریب
فلک پہ برق جہاں سوز کی چمک ہے عجیب
نگاہ برہم انجم ملیٹ رہی ہے نصیب
ہزاروں رنج و الم بے گناہ سہتے ہیں
جبین دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں!

بپھر کے جنگ کی دیوی نے سونت لی تلوار
نگاہیں غیض کے آتش کدے، زباں خونخوار
خدا ہی جانے کہ کس کس کا یہ کرے گی شکار
فلک بھی بھول گیا اپنی شوخی رفتار
جو مہر و مہ تھے درخشاں وہ آج گہتے ہیں
جبین دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں!

بساطِ دہر کی اب ہو چکی ہے قطع و بُرید
رواں ہے آتشِ سیال کی طرح سے حدید
فلک سے ٹوٹ کے گرتے ہیں سیکڑوں خورشید
یہ غالباً ہے کسی انقلاب کی تمہید
ہزاروں خون کے چشمے اُبل کر بہتے ہیں
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں!

ریاضِ دہر میں اب گُل کہاں مہکتے ہیں
ہوا میں گیس ہے جس سے بشر سسکتے ہیں
زمیں پہ ذرّے نہیں ہیں شرر چمکتے ہیں
فضا میں بم نہیں پیکِ اجل لپکتے ہیں
وحوش کی طرح غاروں میں لوگ رہتے ہیں
جبیں دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں

مری سمجھ میں ابھی تک یہ راز آ نہ سکا
زمانہ شمعِ محبت یہاں جلا نہ سکا
یہ اپنے چہرے سے داغِ جفا مٹا نہ سکا
زمیں کی پیاس کو خونِ بشر بجھا نہ سکا!
سنا ہے اس میں کچھ اہلِ کرم بھی رہتے ہیں؟
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں!

فکاہات

محفل ہند میں دستور نہ کچھ اور چلے
اگلے وقتوں ہی کے چلتے رہے جس طور چلے
نہ کوئی پینے کی ساعت ہے نہ کھانے کا وقت
دیکھیے جس کو وہ تیار ہے جب دَور چلے

تعلیم نسواں

ایک مرد پیر بولے یہ عورت کی ذات ہے
اے مومنو پڑھانا اسے واہیات ہے
میں نے کہا کہ عائشہ صدّیقہؓ تھیں ادیب
بولے کہ آپ چپ رہیں یہ اور بات ہے

شوق مُلازمت

مانگی ہے بھیک برسوں نواح کنشت میں
جب آئی ہے کہیں یہ غلامی سرشت میں
طوق ملازمت رہے گردن میں تا حیات
غلماں بنوں الٰہی جو پہنچوں بہشت میں

متفرق اشعار

خدائے لایزال ہی وہ واجب الوجود ہے
نہ جس کی ابتدا ہیں کچھ نہ جسکی انتہا ہیں کچھ

یہ بزمِ مے ہے اور ترا امتحان ہے
جو جامِ تلخ آئے اُسے مسکرا کے پی

ابھی آئے تھے کہ ابھی چلے، ہوئے خاک، خاک میں مل گئے
یہی زندگی کو قیام ہے؟ یہی زندگی کا مآل ہے؟

مرے عزم و تخیل پر بھی اس کی حکمرانی ہے
مگر صیاد کہتا ہے کہ میں ہی اسکے بس میں ہوں

کہاں گیا مجھے گم کر کے کارواں میرا
غبار تک بھی سرِ رہ گزر نہیں ملتا

خزاں۔ رخسارِ گل پر رنگ و بو کا پردہ رہنے دے
کہ لطفِ زندگانی اس فریبِ رنگ و بو تک ہے

آدم کا نقشِ پا ہے ملایک کی سجدہ گاہ
محمودؔ مشتِ خاک کی توقیر دیکھنا!

پروں کو دیکھ کے ہوتی ہے حسرتِ پرواز
میں اُن کو نوچ نہ ڈالوں تو کیا کروں صیاد؟

چمن میں پھر بھی بیداری نہ پیدا کر سکی شبنم
اُسے گو بارہا غنچوں کی آنکھیں دھوتے دیکھا ہے

وہ گل ہی کیا رہے جو گل کی صورت چشمِ بلبل میں
میں وہ گل ہوں کہ گلشن کی طرح چشمِ مگس[1] میں ہوں

گلشن میں نسیمِ صبح اعجاز دکھاتی ہے
جو پنکھڑی ہلتی ہے تتلی نظر آتی ہے

---

[1] مکھی کی آنکھ سیکڑوں آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

غبار راہ کو اے ہم سفر حقیر نہ جان
بنائے عالم امکاں اسی غبار سے ہے

بنائے فطرت ہستی ہے اضداد عناصر پر
کیا کرتی ہیں امواجِ خنک برق تپاں پیدا

یہاں تخریب سے تعمیر کی بنیاد پڑتی ہے
گل تر مردہ کرتے ہیں خمیر بوستاں پیدا

خزاں نے گل مٹا دیئے مگر اثر نہ مٹ سکا
کہ اب بھی انکی نکہتیں ہیں دامن صبا میں کچھ

اپنے سایہ پہ بھی وحشی کو ہے زنداں کا گماں
چلتے پھرتے در و دیوار نظر آتے ہیں

برق کے شرارے خود موجِ گل میں پنہاں ہیں
باغباں کہاں لیجائے کوئی آشیاں اپنا؟

چنتا ہوں آئے دن گلِ حسرت نئے نئے
گلزارِ دل سے رونق بزم خیال ہے

رہ نیاز سے ہو کر گیا ہے جادۂ عشق
خودی کو چھوڑ خودی سے خدا نہیں ملتا

پلک سے اشک کے قطرے گرا کے لیتا ہوں
میں آسمان سے تارے چھٹا کے لیتا ہوں

جو گر جائے تو اک داغِ سیہ ہی روشنائی بھی
مگر نوکِ قلم پر آ کے گوہر ریز ہوتی ہے

دُرِ شہوار تو پیدا بڑی مشکل سے ہوتا ہے
صدف کے بطن میں دُردانہ ہی مدت میں بنتا ہے

ابھی کچھ تھا ابھی کچھ ہے عجب رنگ زمانہ ہے
یہ معمورہ ہے یا گردش میں اک تصویر خانہ ہے؟

کوئی بھی دیدہ ور میکش نہ آیا کنج وادی میں
ہزاروں جام گل شبنم نے بھر بھر کر گرا ڈالے

بیٹھے ہیں ابھی سیکڑوں رہ گیر سر راہ
منزل پہ پہنچ کر بھی نہ ہو بانگ درا بند

محمود فکرِ گردشِ دوراں فضول ہے
تو اسکے رخ کو موڑ سکے گر تو موڑ دے

گل اپنی آنکھوں سے گلشن میں خون روتی ہیں
کہ اس دیار میں اہل نظر نہیں ملتے

غالباً فطرت ہی میری کچھ اذیت کوش ہے
اپنی آہوں سے حبابِ دل میں دم بھرتا ہوں میں

گیاہ کوہ سنگِ رہ سے بمرّش لیکے اُگتی ہے
ابھی تک یادگارِ تیشۂ فرہاد باقی ہے

سوزشِ دل میں نہاں جلوۂ مقصود بھی ہے
شمع محفل میں نہ آئی تھی کہ پروانہ بنا

ایک پستی میں ہیں محوّد نہاں لاکھ عروج
مُلک برباد ہوئے جب کہیں ویرانہ بنا

گلوں کو شعلہ ساماں کردیا ہے سوز باطن نے
عجب کیا ہے ہوا ہو بطنِ نیّر سے جہاں پیدا

کلام دلکش و مربوط و مختصر اچھا
مبالغہ نہ ہو جتنا اسی قدر اچھا

جو اتنا سہل و رواں ہو کہ نثر ہو نہ سکے ق
جو دل کی سطح سے اپنے نقوش کھو نہ سکے

قصور اپنا تھا کیوں دل میں دی جگہ غم کو
جو ہم نے چاہا تھا آخر وہی ملا ہم کو

یہ عالم آئینہ ہے اس میں دل کا عکس آتا ہے
اگر دل مسکراتا ہو تو یہ بھی مسکراتا ہے

بلا محنت اگر ہیرا بھی مل جائے تو پتھر ہے
اگر پتھر ملے محنت سے تو ہیرے سے بہتر ہے

زحمت افلاس سے انسان کو کم ہوتی ہے
خواہشِ زر ہی مگر موجبِ غم ہوتی ہے

کون اس گلکدۂ دہر میں غمناک نہیں
کوئی بھی پھول ہے ایسا کہ جو صد چاک نہیں؟

نہ کرتا چاک گر فرہاد سینہ کوہساروں کا
نہ ہوتا دل نشیں اس درجہ شیون آبشاروں کا

آہ جو بوندیں یہاں خاک میں مل جاتی ہیں
اُنھیں بوندوں سے سمندر میں گہر بنتے ہیں

ہر چند انبساط و الم جزوِ زیست ہیں
زنجیر پا ہوں یہ بھی تو ان کو بھی چھوڑ دے

وادیٔ زندگی میں خرد خضرِ رہ سہی
لیکن رہِ نیاز میں اس کو بھی چھوڑ دے

غم ہی غم ہے اس عالم میں ہنس کر غم کو ٹال نہ دیں؟
جیتے جی کا رونا ہے یوں کب تک روئے جائینگے!

نظر والوں کو بھی دشوار ہے ا ہلِ نظر ہونا
کہ ہم نے دیدۂ بیدار کو بھی سوتے دیکھا ہے

چمن میں موسمِ گل کر رہا ہے آتش افروزی
نسیمِ صبح آئے اور ہوا کو معتدل کر دے

اک اک گھڑی پہاڑ سی کٹتی ہے چارہ گر
خلوت عذاب ہے جو کوئی مشغلہ نہ ہو

جو کبھی سبب تھا نشاط کا وہی آج وجہِ ملال ہے
نہ یہاں خوشی نہ یہاں الم یہ جہاں جہانِ خیال ہے

تری چشمِ شوق پڑے اگر نظر آئیں عیب بھی پھر ہنر
تری دلکشیٔ نگاہ کا ہی جہاں میں نام "جمال" ہے

ہر جرعۂ جامِ زیست کا پھر خوش گوار ہو
گر چرخ اس میں خوشۂ انجم نچوڑ دے

"احساس کمتری" جو تجھے وجہِ ناز ہے
یہ بھی ہے اک طلسمِ نظر اس کو توڑ دے

تری بعد زیست ہے مرگ اور مری بعد مرگ حیات ہے
مگر اپنی اپنی تلاش ہے، مگر اپنا اپنا خیال ہے

افسردہ ہو کے رہ گئے لبہائے شادماں
زخموں کو کس قدر المِ اندمال ہے!

عالم بیخودی ہی میں سیرِ چمن کا لطف ہے
موسمِ گل کا خوں نہ کر تجزیۂ بہار سے

جس قدر آنسوؤں میں خونِ جگر گھلتا ہے
اتنا ہی داغِ الم سینے سے بھی دُھلتا ہے

زاہدِ خشک سے کچھ نفع نہیں ہوتا ہے!
کہیں بنجر میں کوئی تخمِ شجر بوتا ہے؟

نشاطِ دہر کا انجام مایوسی و محرومی
دلِ ارماں طلب نا آشنائے آرزو ہو جا

کیا تو جگنوؤں نے گل میں کچھ سوزِ نہاں پیدا
فضائے گلستاں میں ہو گئیں چنگاریاں پیدا

میں درد کو بھی اپنی دوا کہہ نہیں سکتا
مستور ہے احساس شفا نقطِ دوا میں

گنہ کیا جب تصور بھی گنہ کا دل میں آتا ہے
مجھے گویا اجل سر پر کھڑی معلوم ہوتی ہے

توحید کی شراب مصفا بھی پی کے دیکھ
کیا پی جو شرک و کفر کی بدبو ملا کے پی

گر نفس ہو کمزور تو ایمان قوی ہو
وہ مرد ہے جو بند علائق سے بری ہو

رنگ اُسی کے گل میں ہیں اسکے شرر ہی گُل میں ہیں
طور پہ جو لگی تھی آگ وہ ابھی تک دبی نہیں

میں نے مے حجاز سے پائی وہ روح بیخودی
تاک میں جو نہیں ساغر جم میں تھی نہیں

لاکھوں گلوں کے چہروں پر غازہ چڑھا رہا ہے مہر
اسکے نگارخانے میں پھر بھی کوئی کمی نہیں!

کشتۂ تیغ چرخ کے خون کا غازہ ہے شفق
رنگ جفا نہ ہو تو پھر حسن میں دلکشی نہیں

جس آنکھ کو جمال حقیقت نظر نہ آئے
اس پر نظارۂ گل و گلشن حرام ہے

اب یہ نظر کا کام ہے، وہ منتخب کرے
قلزم میں آب شور بھی آب گہر بھی ہے

فرصت ملے تو جسم کی صنعت پہ غور کر
تو خود ہے ایک چھوٹی سی دنیا لئے ہوئے

جو سوچا تو غلط سوچا جو سمجھے تو برا سمجھے
ہمارا مدعا کچھ اور تھا اور آپ کیا سمجھے

یہ گل چینی کے باعث باغباں کو فکرِ گلشن تھی
سمجھتے تھے کہ اس کو اُنس ہے صحن گلستاں سے

انسان کی فطرت بھی عجب فطرت ہے
جس بات سے روکیں یہ وہی کرتا ہے

تجھ کو گر شوق شہادت ہے تو آ مقتل میں
دیکھنا ہے کہ ترے سینے میں دم کتنا ہے

جو موجیں تند ہوں تو دست و پا کو اور جنبش دے
جو ساحل دور ہو تو حوصلے دل کے بڑھاتا جا

قطعات

طریقِ کار

جو کام کیا جائے نفاست سے کیا جائے
مستعدی و دلچسپی و ہمت سے کیا جائے

مانا کہ ترقی میں سرِ بام نہ ہو گے
لیکن یہی کیا کم ہے کہ بدنام نہ ہو گے

وجہ ناکامی

تیری حیات دہر میں ناکامیاب ہے
دن رات اضطراب ہے جینا عذاب ہے
بد قسمتی پہ اشک بہانے سے پیشتر
یہ سوچ کیا کوئی تری عادت خراب ہے؟

صحبتِ بد

صحبت زشت سے اللہ بچائے رکھے
اس سے تو جوہر فطرت بھی بدل جاتے ہیں
پرتوِ خور سے جو ذرّات چمک اُٹھتے ہیں
خشت میں مل کے وہ پھر خشت ہی کہلاتے ہیں

شر میں خیر کا پہلو

ہمیں جس شر پہ خرابی کا گماں ہوتا ہے
پہلوئے خیر بھی اس شر میں نہاں ہوتا ہے
برق کی مثبت و منفی جو رَوَیں ہوتی ہیں
ان کے ٹکرانے ہی سے نور عیاں ہوتا ہے

مسلم کا جمود

مائل نشو و نما ہے دل مسلم کا جمود
یہ ابھی مثل شجر جورِ خزاں سہتا ہے
بحر کی سطح جو ساکن بھی کبھی ہوتی ہے
اس کے سینے میں تلاطم ہی بپا رہتا ہے

عارضِ حق

گرچہ ہر ذرہ میں معمور ہی پایا تجھکو
دیدۂ شوق سے مستور ہی پایا تجھکو
کچھ دکھا ہی نہ سکا فلسفہ کا آئینہ
جس قدر غور کیا دور ہی پایا تجھکو

NEGATIVE & POSITIVE CURRENTS.　ـلـه

اصُول سیرت

(فوق النقوط)

خود فراموش ہو احسان فراموش نہ ہو
حق کا ہو موقع اظہار تو خاموش نہ ہو
عاشقِ حسن ہو تو مثل عنادلِ محمود
لطف نظارہ اٹھا اور ہم آغوش نہ ہو

شاعری

وہ شاعری جو دے ہمیں تلقین بیخودی
وہ خفتہ حسیات کو مردہ بنائے گی
اور جس میں ذکر مطرب و بزم و سرود ہو
وہ ذہن سے تجسسِ فردا مٹائے گی

راہِ سلوک

منطقی اپنی دلیلوں ہی میں پھنس کر رہ گیا
شیخ تاویلات کی دلدل میں دھنس کر رہ گیا
سُن کے ان کج بحثیوں کو رہرو راہِ سلوک
پستی عقل فرومایہ پہ ہنس کر رہ گیا

رُباعیّات

نذرِ حمد

اے جلوۂ چشم آفتاب و اختر سرچشمۂ نور و خالقِ اہلِ بصر
دیکھوں میں تجھے تو کس نظر سے دیکھوں جب اپنی نظر سے آپ اوجھل ہو نظر

ہدیہ نعت

محمودؔ جو اپنی نعت لے کر آیا دھونے کو زبان حوض کوثر آیا
ارواح میں دھوم تھی کہ سُبحان اللہ دربار رسالت کا سُخنور آیا

کیا کیا مانگوں

درگاہ خدا میں مصطفےٰ کو مانگوں دربارِ رسالت میں خدا کو مانگوں
بے مانگے وہ مانگے سے سوا دیتا ہے ہے بوالہوسی جو ماسوا کو مانگوں

التجا

اے رحمت حق نہ بے نیازی فرما ناچار ہوں میری چارہ سازی فرما
اے جانِ امید مرہم سینہ فگار دل گیر ہوں میری دل نوازی فرما

ماعرفناک

مخلوق سے خالق کی ثنا کیونکر ہو اور حق عبودیت ادا کیونکر ہو
جب فہم کا خالق بھی وہی ہے محمود جو اس میں سما جائے خدا کیونکر ہو

درس قناعت

محمود! عمل ہمیشہ محمود کرو بیہودہ تکلفات مسدود کرو
اک جان کے پیچھے اور اتنے کھڑاگ! تم اپنی ضروریات محدود کرو

درمانِ حقیقی

ہر درد و الم میں تجھ کو درماں پایا
دوری میں بھی نزدیک رگ جاں پایا
کیا شان ہے اللہ تری اللہ اللہ
ہر حال میں فضل تیرا یکساں پایا

فیض مرگ

اے قبر شکستہ پہ گزرنے والے لذات جہاں پہ ناز کرنے والے
کچھ ان کے عطیات کو ہو شکر گزار جو چھوڑ گئے زمیں پہ مرنے والے

زعم خود پرستی

یہ کشمکش بلند و پستی کیوں ہے؟ ہنگامۂ کارزارِ ہستی کیوں ہے؟
دریائے جہاں میں تو ہے اک نقش بر آب محمودؔ یہ زعم خود پرستی کیوں ہے!

مآلِ دُنیا

ہستی کا کمال خوب دیکھا ہم نے انجامِ زوال خوب دیکھا ہم نے
اس کو بھی فنا ہے اور اس کو بھی فنا دنیا کا مآل خوب دیکھا ہم نے

درسِ اخلاق

عاقل سے نصیحت لے جہاں تک لی جائے
پی جائے مئے عشق تو مر کر جی جائے
نیکی کا عوض جہاں میں نیکی ہے فرض
اخلاق یہ ہے بدوں سے نیکی کی جائے

محمودؔ کا نصب العین

خیام یہ کہتا ہے کہ پی جام یہ جام حافظ کا یہ ہے قول کہ لے فقر سے کام
رازی کی نصیحت ہے کہ بن فلسفہ داں محمودؔ کا منشا ہے کہ چمکے اسلام

توشۂ آخرت

ظاہر ہے کہ ایک دن تجھے مرنا ہے
پیمانۂ زندگی کو خود بھرنا ہے

ناداں! وہ کام کر کہ آئے کچھ کام
غربت میں تجھے نیا سفر کرنا ہے

مُرقع حسرت

بے مہروں سے چاہ کر کے رہ جاتا ہوں
حسرت سے نگاہ کر کے رہ جاتا ہوں
ہنستے ہوئے دیکھتا ہوں جب کلیوں کو
گلشن میں اک آہ کر کے رہ جاتا ہوں

از ماست کہ بر ماست

تو سطحِ دماغ کو ذرا بالا کر
ان پست خیالات کو کچھ اعلیٰ کر
الزام مشیت پہ لگانے سے قبل
اپنے کردار پر بھی نظر ڈالا کر

سیف و قلم

تسخیرِ صفت جو کلکِ حکمت کی ہے
کب تیغ کے وہ قبضۂ قدرت کی ہے
شمشیر نے گو فتح کیا ہے عالم
خامہ نے مگر اس پہ حکومت کی ہے

استقبال بہار

عالم میں خیر چمن طرازی کی ہے
جاروب کشی صبا نے کافی کی ہے
سبزے نے بھی جا بجا بچھایا ہے فرش
شبنم نے گلوں پہ عطر پاشی کی ہے

احساس زوال

عزت کا اگر پاس ہو ہم کو اپنی
اور زیست کی کچھ آس ہو ہم کو اپنی
دشوار نہیں ہے بلکہ ناممکن ہے
پستی کا نہ احساس ہو ہم کو اپنی

صرف بے محل

ان چند نفس کی قدر و قیمت سمجھو
جو وقت ملے اسے غنیمت سمجھو
اک مفلس با وضع غنی ہو تو ہو
مسرف کو مگر کبھی غنی مت سمجھو

بقائے الفت

گلشن میں نہ گل نہ گل میں رنگت باقی
لیکن ہے صبا میں اس کی نکہت باقی
احباب ہیں بزم میں نہ ذکرِ احباب
البتہ ہے دل میں ان کی الفت باقی

تزئینِ عالم

عالم کو جمادات نے شوکت بخشی
اور پرتوِ حسن نے لطافت بخشی
گلدستۂ اعمال کے ہر غنچے کو
محمودؔ خیالات نے رنگت بخشی

تعلیمِ شکیبائی

ہم بچ کے جہان سے کدھر جائیں گے
ہوگا یہی آسماں جدھر جائیں گے
اس عیشِ گذشتہ کی طرح اے محمودؔ
ایام مصیبت بھی گزر جائیں گے

فطرتِ گل

ہنس ہنس کے وہ شبنم سے نہا لیتا ہے
اور تھوڑا سا عطر بھی لگا لیتا ہے
انساں سے تو پھول ہی کہیں اچھا ہے
کچھ لطفِ حیات تو اٹھا لیتا ہے

ضیق النفس کا دورہ

اک شورِ فغاں سینۂ غمناک میں ہے
اور حسرتِ خواب چشمِ نمناک میں ہے
مرتا ہوں نہ جیتا ہوں عجب حالت ہے
اس تنگیٔ نفس سے دم ناک میں ہے

مسلم جانباز

باطل سے مسلماں کہیں ڈر سکتا ہے — وہ سایہ خنجر میں گزر سکتا ہے
جانبازوں کے شہ کار سنانے والے — تو چاہے تو خود بھی انھیں کر سکتا ہے

نیک سیرت

بے فائدہ مخلوق گلا کرتی ہے — مانگے سے خوشی کہیں ملا کرتی ہے
محمودؔ خوشی ہے نیک سیرت کا ثمر — بد سیرتی وقف ابتلا کرتی ہے

دولتمندوں سے خطاب

تم سر سے یہ نشّہ امارت کھوتے — محتاج کا داغ بے نوائی دھوتے
اے اونچی عمارتوں کے رہنے والو — اخلاق بھی کچھ تمھارے اونچے ہوتے

سعی لاحاصل

پیچیدہ مسائل ہمیں اُلجھاتے ہیں
ہم عقل کے شانے ہی سے سُلجھاتے ہیں
ہم ناقص اور عقل بھی ہماری ناقص
چھانیں جتنا اتنا کرکلا کھاتے ہیں

مذمتِ شراب

انگور کی میں عرق فشانی دیکھوں
اور شرم سے اس کو پانی پانی دیکھوں

خورشید کا جام بھی نظر سے گر جائے
گر اس میں شراب ارغوانی دیکھوں

سرمایہ زندگی لٹا دوں ساقی
پھر تجھ سے لیں اک جرعہ ئے ٗوں ساقی

تو نے۔ مجھے دیوانہ سمجھ رکھا ہے
ایسا تو میں دیوانہ نہیں ہوں ساقی

مٹ جائے گا غم توئے کے پیانے سے
جائے گی خرد پھر یگے دیوانے سے

ساقی سے کہیں جو ایک چلّو مانگی
اڑ جائے گی شرم ہاتھ پھیلانے سے

جبر و قدر

گو نیکی بدی خدا نے پیدا کی ہے
پر قوت امتیاز تجھ کو دی ہے

تلوار بنانے والا کیوں مجرم ہو
مجرم تو فقط چلانے والا ہی ہے

رازِ کلفت

پختہ گِلِ خام کو بناتا ہے کمہار
اور اس کے وقار کو بڑھاتا ہے کمہار
یہ سمجھے اگر کوئی تو نادانی ہے
ناحق اُسے آگ میں تپاتا ہے کمہار

دولت کے چونچلے

جب آمدنی دوچند ہو جاتی ہے
انساں کی نظر بلند ہو جاتی ہے
سامانِ نشاط سب بدل جاتے ہیں
جو شے ہے وہ ناپسند ہو جاتی ہے

رُوحِ عمل

اخلاق نہ سُدھرے تو عبادت بے کار
سرکش ہی رہا دل تو اطاعت بیکار
بے سمجھے اگر نماز پڑھ لی تو کیا
قرآن پہ عمل نہ ہو تو قرأت بے کار

اُلٹی دلیلیں

یہ اُلٹی دلیلیں ہمیں بہکاتی ہیں
آئینۂ ادراک پہ چھا جاتی ہیں
دیکھو تم آئینے بالمقابل رکھ کر
اک شکل کی دو شکلیں نظر آتی ہیں

خوئے عمل

خوئے عمل اختیار کرنی ہے فقط
عادت یہی پائیدار کرنی ہے فقط
قلعے تو بنا چکے ہوائی ہی سہی
بنیاد ہی استوار کرنی ہے فقط

توکّل علی اللہ

کب شیفتۂ حُسن و رنگ و بُو کا ہوں میں
اک بھٹکا ہوا مقام ہُو کا ہوں میں
عالم سے غرض نہ اہل عالم سے غرض
اللہ ترے کرم کا بھوکا ہوں میں

توہین انسانیت

انسان جسے چرخ آنکھوں میں جا دیتا ہے
فخر اپنا وہ خاک میں ملا دیتا ہے
خود گھڑتا ہے سنگ ناتراشیدہ کو
اور آگے اُسی کے سر جھکا دیتا ہے

انجامِ تذبذب

جب نشہ جوانی کی اتر جائے گی   تب ساحل مقصد پہ نظر آئے گی
موقع وصل کی راہ تکتے تکتے   محمود یہ زندگی گزر جائے گی

اہتمامِ ہستی

محمود! یہ نشۂ جوانی کب تک   یہ خواہش عیش جاودانی کب تک
یہ زحمتیں بہر زندگانی، توبہ   دے گی ترا ساتھ زندگانی کب تک

رفتارِ ترقی

جو درس عمل سوچ کے پڑھ جاتا ہے
گو بام عروج پر وہ چڑھ جاتا ہے
لیکن اک جست میں جو آیا وہ گرا
اک ایک قدم بڑھا تو بڑھ جاتا ہے

جذبۂ اخلاص

احسان کی صورت میں درم ملتا ہے   اغراض کے پردے میں کرم ملتا ہے
ہر وصف سے انسان کا دل ہے معمور   اک جذبۂ اخلاص ہی کم ملتا ہے

حقوق و فرائض

حق اپنے جو پائمال کرتا تھا میں — واللہ بہت ملال کرتا تھا میں
لیکن سوچا تو وہ فرائض تھے مرے — ناحق جنھیں حق خیال کرتا تھا میں

فلسفۂ حق

دنیا کی سیاست سے گزر کے دیکھو — اس سطح سے کچھ اور ابھر کے دیکھو
تقلید فرنگ سے نہ کچھ کام چلا — قرآن کی پیروی بھی کر کے دیکھو

تقدیر و تدبیر

اندیشۂ فردا میں عبث روتا ہے
تقدیر کی لوح کوئی یوں دھوتا ہے
جینا ہے تو تقدیر پرستی سے نکل
پھر دیکھ کہ تدبیر سے کیا ہوتا ہے

درسِ تہذیب

اطفال کو تہذیب معلم سکھلائیں — یا تربیت خلق مکانوں میں پائیں
سیرت کے گھر بنائے سے بنتے ہیں — کنکر پتھر نہیں جو یوں ہی مل جائیں

مدح صدر بزم

گلشن کا جمال گل کی رنگت سے ہے
گردوں کو فروغ مہ کی زینت سے ہے
جلوے سے ہے شمع کے بہار شبِ تار
اس بزم کی شان اس صدارت سے ہے

دین سے غفلت

انسان بمشکل کوئی ایسا ہوگا ہر وقت جو اللہ سے ڈرتا ہوگا
اندیشہ حشر تو کسی کو بھی نہیں کیا جانئے حشر اس کا اب کیا ہوگا

فلسفہ حیات

ہر بزم میں اک حُسنِ ادب پیدا کر ہر رنج میں اک رنگِ طرب پیدا کر
ماضی سے بہر حال یہ حال اچھا ہے جینا ہے تو جینے کا سبب پیدا کر

حقیقت کائنات

قطرہ ہی تو ہے گوہر تاباں کیا ہے ؟ پتھر ہی تو ہے لعل بدخشاں کیا ہے ؟
اک چاک ہے کوزہ گر کا دہرِ رقصاں مٹی کا کھلونا ہے یہ انساں کیا ہے ؟

قومی سیرت

جس طرح کہ ہر پھول کی بُو ہے مخصوص
ایسے ہی ہر اک قوم کی خو ہے مخصوص

تہذیب پہ مغرب کی جو تو نازاں ہے
نادان کب اس کے لئے تو ہے مخصوص

سنگِ راہ

جب تک کہ رہے گی ہم میں اندھی تقلید
جب تک کہ رسوم کی نہ ہو گی تجدید
جب تک کہ مذاہب کو نہ سمجھیں گے عوام
ہم کو تو ترقی کی نہیں ہے امید

عالم خیال

جب حدّ تصور سے گزر جاتا ہوں
طے عالم ادراک بھی کر جاتا ہوں
تب اپنی حقیقت پہ نظر جاتی ہے
عالم نیا ہوتا ہے جدھر جاتا ہوں

نعمُ البدل

دانا ہے تو تقدیر کو ہمت سے بدل
اور خوف گریز پا کو جرأت سے بدل
عشرت کا سکوں عمل کی لذت سے بدل
صورت کا جمال حسن سیرت سے بدل

جزائے اعمال

اخلاق جمیلہ کی جزا پاتا ہے
ذہنیت پست کی سزا پاتا ہے
کردار کے دنیا ہی میں پھل ملتے ہیں
انسان یہیں ان کا مزا پاتا ہے

مُردمِ چشم

ہے مردم چشم اک تماشا گویا
شیشے میں اتر رہا ہے نقشا گویا
ہر بوند میں اس کی ہے چمن کا پرتو
قطرے میں سما رہا ہے دریا گویا

وُسعتِ شاعری

غنچے کے چٹکنے کی جو آواز ہے یہ
بزم طرب نطق کا اک ساز ہے یہ
منقار عنادل میں جو یہ نغمے ہیں
جادوئے سخن کا میرے اعجاز ہے یہ

جگنو

کیا کرمکِ شب تاب نے دکھلائی بہار
کرتے ہیں یہ تارِ زر سے چلمن تیار
یہ چرخ سے ٹوٹے ہیں ستارے محمودؔ
یا رات کو چھُٹ رہے ہیں گلشن میں انار؟

تقاضائے قدرت

ناسورِ الم سینے میں پڑتا جائے
صبر اشک کے گوہر اس میں جڑتا جائے
قدرت کا تقاضا ہے کہ ہر نقشِ ستم
موجوں کی طرح بن کے بگڑتا جائے

قحط الرّجال

انسان تو ہے، جذبۂ انساں نہ رہا
گلزار تو ہے، ذوقِ گلستاں نہ رہا
صحرا بھی ہے لیلیٰ بھی ہے محمل بھی مگر
مجنوں سا کوئی مردِ بیاباں نہ رہا

تدبیر یا توکل

یا خود دل ناخدا میں ہمت بھر دے
کشتی کو خود اپنے وزن کا لنگر دے
یا کچھ بھی نہ کر کھینچ لے دست تدبیر
اور اس کو تو اللہ کے حوالے کر دے

جبر و قدر

تنکا ہوں قدم قدم پہ رہ جاتا ہوں
گرداب میں گھومتا ہوں بہ جاتا ہوں
چلنے کی نہ قدرت ہے نہ رکنے کی مجال
افتاد جو پڑتی ہے وہ سہ جاتا ہوں

رجوع الی اللہ

اوقات جو میرے روز و شب میں گزرے
اندوہ میں یا عیش و طرب میں گزرے
محمودؔ کی التجا ہے تجھ سے یا رب
جو دم ہے وہ اب تیری طلب میں گزرے

کتاب حیات

ہر سال کو ایک باب سمجھا ہوں میں
کیا نکتۂ لاجواب سمجھا ہوں میں
دن رات ہیں جس کے غیر فانی اوراق
اس زیست کو وہ کتاب سمجھا ہوں میں

شوقِ تحقیق

تحقیق کی خو ضرور تو پیدا کر
ایجاد کی دل میں آرزو پیدا کر
جو بات محال ہو اُسے جانے دے
دشوار کے حل کی جستجو پیدا کر

جوہر ہمت

ہمت کا ترے پاس وہ جوہر بھی ہے
خیرہ جس سے چشم مہر انور بھی ہے
بن سخت مصیبت میں مصیبت سی سخت
فطرت تری موم بھی ہے پتھر بھی ہے

دَورِ زندگی

طفلی کا زمانہ روتے دھوتے گزرا
اور عہدِ شباب سوتے سوتے گزرا
پیری میں کھلی آنکھ تو مانندِ حباب
یہ وقت بھی صبح ہوتے ہوتے گزرا

شادیِ طلاب

یوں تو لازم ہے یال بچوں کا خیال
تعلیم میں ہے وبال بچوں کا خیال

جب دست تہی ہو اور ادراک ہو خام
شادی کا ہے خیال بچوں کا خیال

وصفِ پیری

گلزار خرد پختہ ثمر لاتا ہے — تکمیل کو ہر وصف پہنچ جاتا ہے
صورت سے عیاں ہوتا ہے سیرت کا حسن — انسان کا پیری میں شباب آتا ہے

احترامِ جذبات

ساقی! گر فرق نہ اپنے بیگانے میں — آجائے جو مردِ پیر میخانے میں
پیمانۂ روز و شب سے اس کو مت ناپ — بھر روحِ شباب اسکے پیمانے میں

حُرمتِ نسواں

گھر گھر کیا دنیا میں اُجالا تو نے — اور حُسنِ جہاں کیا دوبالا تو نے
کرتے ہیں ملائک تری عزت خاتون — آغوش میں انبیا کو پالا تو نے

رموزِ حیات

تو صورت غنچہ لب ہلانا بھی سیکھ
اور بن کر دل چاک مُسکرانا بھی سیکھ
شبنم کی طرح مرمٹا روتے روتے
کچھ باغ جہاں میں دل لُبھانا بھی سیکھ

فیضانِ کرم

رحمت کے سمندر میں جو موج اُٹھتی ہے
وہ ڈوبتے کی مدد کو فوج اُٹھتی ہے
گر ذوقِ طلب شکستہ پا میں ہو تو پھر
تعظیم کو خود منزلِ اوج اُٹھتی ہے

تشابۂ نیّرین

وہ سوئے فلک دیکھتے شرماتے ہیں
جُھک جُھک کے ہلال خود بنے جاتے ہیں
ان کو دیکھوں کہ ماہِ نو کو دیکھوں ؟
دونوں میں وہی جلوے نظر آتے ہیں

حقیقتِ عقل

اے عقل یہ اپنی پیش و پس رہنے دے
دنیا کی نہ کر اتنی ہوس رہنے دے

اس ہستیِ موہوم کی ہستی کیا ہے؟
محمود کو معلوم ہے بس رہنے دے

رازِ تخلیق

گر حُسن کی تشریح رقم ہو جائے
دوزخ بھی نمونۂ ارم ہو جائے
تخلیق کے پردے سے اٹھا دوں جو نقاب
دنیائے جمال اسی میں ضم ہو جائے

عجزِ ادراک

جب جوہر ذاتی کو عیاں کرتا ہوں
خورشید کو ذرّے میں نہاں کرتا ہوں
جب جاتی ہے اپنی بے ثباتی پہ نظر
لَا عِلمَ لَنَا وردِ زبان کرتا ہوں

قدر احباب

جب پیک اجل فنا پہ اڑ جائے گا
سب کھیل بنا ہوا اگڑ جائے گا
ان چند رفیقوں کو غنیمت سمجھو
محؔمود یہ قافلہ بچھڑ جائے گا

تمنائے مرگ

جام غم و اندوہ پیئے جاتا ہوں
بادیدۂ تر ضبط کیے جاتا ہوں
کچھ ٹھوکریں کھانی ہیں ابھی قسمت میں
مرنے کی تمنا میں جیے جاتا ہوں

طلوع خورشید

خورشید جو بعد شب مدام آتا ہے
اک تازہ حیات کا پیام آتا ہے
اے بادۂ زیست کے سُبوکش ہُشیار
تیرے لئے زرنگار جام آتا ہے

یاد شباب

سرمایۂ عیش زندگانی نہ رہا
احساس نشاط و کامرانی نہ رہا
افسوس مجھے لوٹ لیا پیری نے
اب کیا رہا جب عہد جوانی نہ رہا

اعترافِ کم مائگی

مایوس ہوئے سُراغ پاتے پاتے دریائے سخن کی تہ میں جاتے جاتے
موتی نہ ملے حباب دو چار ملے وہ بھی نہ رہے ہاتھ میں آتے آتے

افسانۂ عشق

عشق ایک سرور بخش افسانہ ہے
روشن اس مے سے دل کا پیمانہ ہے
اخلاص کے پھولوں کی ہے آہوں میں مہک
جو اشک ہے دل کشی میں دُردانہ ہے

دیوالی کا چراغ

جو لعل ترے گنج سے کھو جاتا ہے ظلمت کو وہ تنویر سے دھو جاتا ہے
بڑھ جاتی ہے اس سے رونق بزم جہاں دیوالی کا وہ چراغ ہو جاتا ہے

جوشِ ترقی

ذرّہ ہوں مجھے اختر بیدار بنا قطرہ ہوں مجھے قلزم ذخّار بنا
اللہ محال پر بھی تو قادر ہے اک بندہ ناکارہ کو باکار بنا

معمّائے ہستی

انساں کو عالم میں بقا لاتی ہے اور یاد فنا عدم کو لے جاتی ہے
انجام ہے نیستی تو ہستی کیسی؟ یہ بات سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے

عزم راسخ

مَردوں کا سا پہلو میں ترے دل بھی تو ہو
اور دل وہ کسی کام پہ مائل بھی تو ہو
بزدل ہے، تصور سے ڈرا جاتا ہے
مشکل جسے سمجھا ہے وہ مشکل بھی تو ہو

تاج عبودیت

پسنے سے حنا کے جلوہ سامانی ہے جلنے ہی سے شمع کے درخشانی ہے
درگاہ خدا میں جا کے انساں جھک جائے پستی یہ دلیل اوج انسانی ہے

(قطعہ)

شکوۂ مکتوب

مجھ کو تسلیم ہے جو آپ نے ارشاد کیا میں نے نامہ نہ لکھا، آپ کو ناشاد کیا
نہ بُرا مانیں اگر آپ تو میں عرض کروں اس زمانے میں کبھی آپ نے بھی یاد کیا؟

سزائے حق گوئی

(قطعات)

اس دورِ معصیت میں جو چاہے وہ بول لے
تھوڑا سا کذب صدق کے ساغر میں گھول لے

اہلِ ہوس کے مکر پہ حیراں ہے حق شناس
گر سچ کہے تو دشمنیٔ خلق مول لے

شقاوتِ مستقل

جہاں میں حسنِ گل و رنگ آب و گِل بدلا
ہزار حیف کہ انسان کا نہ دل بدلا
ازل سے دیکھتے آئے ہیں اسکی فطرت کو
شقاوتوں میں نہ ابتک یہ ایک تل بدلا

لحد پر رونے والوں سے

خیالِ دہرِ فسوں ساز دل سے کھونے دو
لحد سے خوب مجھے ہمکنار ہونے دو
اُٹھا رہے ہو جو رو رو کے کیا قیامت ہے؟
شبِ حیات کا جاگا ہوا ہوں سونے دو

قیدیوں کی اولاد

ہے بے گناہوں پہ ظلم وستم تماشہ ہے
یہ فردِ عدل میں کیسا نیا اضافہ ہے
گناہگار کو ملتی ہے قید میں خوراک
مگر مکاں میں جو بچے ہیں ان کو فاقہ ہے

فدایانِ علم

بامِ کلفت پہ رہ شوق سے جو چڑھتے ہیں
وہی میدانِ ترقی میں یہاں بڑھتے ہیں
جستجو علم کی رکھتی ہے انھیں سرگرداں
جیتے ہیں پڑھنے کو جینے کے لئے پڑھتے ہیں

شانِ اُولُوالعزم

لوگ جب رات کو بستر پہ پڑے رہتے ہیں
تارے پیشانیٔ گردوں پہ جڑے رہتے ہیں
عرق آلود جبیں پونچھتے جاتے ہیں دلیر
اور سپاہی کی طرح پہروں کھڑے رہتے ہیں

تقاضائے عمر

شاہد و بادہ کا میں ذوق کہاں سے لاؤں
آہ، اس عمر میں یہ شوق کہاں سے لاؤں
دامِ الفت کی اسیری تو ہے آساں محمودؔ
زلفِ پیچاں کا مگر طوق کہاں سے لاؤں

رازِ ناکامی

عیش کوشی کی طرف نفس ڈھلا جاتا ہے
ذکرِ ماضی غمِ فردا کو بھلا جاتا ہے
وقت امداد ہے اے جذبۂ غیرت ہشیار
رازِ ناکامیٔ دل دیکھ کھلا جاتا ہے

نیک انسان

یوں تو رتبے کو ہر اک اپنے بڑھا لیتا ہے
ہے وہی نیک جو غیروں کی دعا لیتا ہے
شیرِ خونخوار سے تو اک خرِ مسکیں اچھا
کچھ نہ کچھ بار تو لوگوں کا اٹھا لیتا ہے

انجامِ کار

عشق اچھا ہے جو مل جائے خدا اس کے بعد
عسرت اچھی ہے جو پیدا ہو غنا اس کے بعد
زندگی اچھی گزر جائے جو بے فکری سے
موت اچھی جو نہ ہو خوفِ سزا اس کے بعد

اسبابِ تنزل

(رباعی)

پابندیٔ اسلام تو کرتے ہی نہیں
اندیشۂ انجام تو کرتے ہی نہیں
جمہور کی اصلاح و ترقی کے لئے
ہم مل کے کوئی کام تو کرتے ہی نہیں

رہِ عافیت

جھگڑے کو بڑھائیں ہم تو بڑھ جاتا ہے
شہ دیں بزدل کو تو سر پہ چڑھ جاتا ہے
بے سوچے نہ ہاں میں ہاں ملاؤ محمودؔ
طوطا بھی پڑھائے سے تو پڑھ جاتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچّوں کی رُباعیّاں

خدا ایک ہے

خالق جو خدا نخواستہ دو ہوتے
لڑ بھڑ کے وہ خود اپنی خدائی کھوتے
اور آتا کہیں نظام عالم میں فرق
جَو اُگتے اگر کسان گیہوں بوتے

روز نہاؤ

دھو کر ہی ہر ایک چیز پکاتے ہو تم
برتن کو بھی دھوتے ہو جو کھاتے ہو تم
کیا جسم پہ جمتے ہی نہیں گرد و غبار؟
پھر کیوں نہیں ہر روز نہاتے ہو تم

اجلے کپڑے پہنو

کپڑے نئے خوب شاد ہو کر پہنو
ایسا نہ ہو منھ بنا کے رو کر پہنو
روزانہ دُھلے ہوئے ہوں کپڑے تن پر
مقدور نہ ہو تو آپ دھو کر پہنو

سگریٹ اور پان نہ استعمال کرو

سگریٹ بیڑی کو منھ لگانا نہ کبھی
جب تک کمسن ہو پان کھانا نہ کبھی
کچھ زہر ملا ہوا ہے تمباکو میں
ہرگز اس کے قریب جانا نہ کبھی

بیمار پُرسی کا طریقہ

بیمار کے پاس جاؤ تو غل نہ مچاؤ
تسکین دو اور اُس کو راحت پہنچاؤ
سوتا ہوا ہو تو چپ رہو سونے دو
گھر والوں سے حال پوچھ کر واپس آؤ

دعوت کے آداب

دعوت میں کسی کے گھر اگر جاؤ تم
تہذیب سے بیٹھو اور کم کھاؤ تم
کپڑے نہ ہوں داغدار کھانے سے کبھی
ایسا نہ ہو محفلوں میں شرماؤ تم

اسکول کے آداب

اسکول میں بولو تو ادب سے بولو
اچکن کے بٹن اور نہ سر کو کھولو
ناخن بھی تراشو، بال بھی صاف کرو
منہ ہاتھ جو میلے ہوں تو وہ بھی دھولو

اسکول کے کام

اسکول میں سامان سنبھالو اپنا
استاد کو ہر کام دکھالو اپنا
پونچھو جو سلیٹ کو تو نم کپڑے سے
منہ پونچھو تو رومال نکالو اپنا

نیک عادتیں

تم راز کسی کا بھی نہ کھولو ہرگز
تلوائے کوئی تو کم نہ تولو ہرگز
گو لوگ ڈرائیں تمہیں مجبور کریں
کچھ بھی ہو مگر جھوٹ نہ بولو ہرگز

وقت کے پابند رہو

بیکار تم اوقات گنواؤ نہ کبھی
بے وقت کوئی چیز بھی کھاؤ نہ کبھی
اوقات ملاقات مُعیّن کر لو
مانند اجبل کہیں بھی جاؤ نہ کبھی

اعتدال سے کام کرو

اتنا کھیلو کہ دور سُستی ہو جائے
اور اتنا پڑھو کہ دل نہ اس سے گھبرائے
اتنا سو لو کہ دن کو تو اونگھ نہ آئے
اتنا بولو نہ جس سے کوئی اُکتائے

جلدی نہ کرو

آہستہ چلو ہمیشہ دھیمے بولو
آہستہ اُٹھاؤ لقمہ اور منھ کھولو
آہستہ بڑوں کے پیچھے پیچھے ہو لو
آہستہ ہی سے کسی سے تم لو جو لو

تندرستی کی قدر کرو

جینا ہو ہنسی خوشی تو میری مانو
کیا چیز ہے زندگی اسے پہچانو
حاصل کرو خوب علم و دولت لیکن
صحت کو ہر اک چیز سے افضل جانو

رنج اور خوشی میں شرکت کرو

اوروں کی خوشی میں تم بھی شرکت کرلو
اور ان کے الم میں آہ تم بھی بھر لو
کرلو احباب کو بھی رنجوں میں شریک
سب اپنی مصیبتیں نہ اپنے سر لو

ہر حال میں شاکر رہو

افضل تو ہزاروں میں کیا ہے تم کو
آغوشِ کرم میں لے لیا ہے تم کو
سمجھو وہی بہتر ہے تمھارے حق میں
اللہ نے جو کچھ بھی دیا ہے تم کو

بے پوچھے نہ بولو

آپس میں جو بولتا سنو تم ڈو کو
خاموش رہو کبھی نہ اُن کو ٹوکو
دیوانے ہی بے پوچھے بکا کرتے ہیں
تم عقل سے کام لو زبان کو روکو

چند پند

دشمن کے حقوق بھی نہ پامال کرو
ہو جائے خطا تو اس کا اقبال کرو
سہہ جاؤ مصیبتیں بہادر بن کر
ایسا نہ ہو رو رو کے بُرا حال کرو

بیکار سوالات نہ کرو

ہر بات میں جو دخل دیا کرتے ہیں
بے کار سوالات کیا کرتے ہیں
احباب کو یہ بات بُری لگتی ہے
وہ مفت کا غم مول لیا کرتے ہیں

کرنے کے کام

وہ کام کئے جا کہ جو معیوب نہ ہو
وہ چیز کبھی نہ لے جو مطلوب نہ ہو
گر خلق نہ ہو تجھ میں، اسے حاصل کر
غربت ہے تو غربت سے تو مجوب نہ ہو

ہر حال میں خوش رہو

موجوں میں زمانے ہی کی بہنا ہے تمھیں
اور اسکے تھپیڑوں کو بھی سہنا ہے تمھیں
پھر کیوں نہ ہنسی خوشی گزارو اوقات
ظاہر ہے کہ دنیا ہی میں رہنا ہے تمھیں

رسم ملاقات

اخلاق و مروت سے ہر اک سے پیش آؤ
اکثر سے ملو، بہت نہ آؤ جاؤ
ہم راز ہو ایک اور مخلص دو چار
اپنا دشمن مگر کسی کو نہ بناؤ

برائیوں سے بچو

دنیا کے چمن سے خوب ہنس کر گزرو
کانٹوں میں مگر نہ اس کے پھنس کر گزرو
پھولوں میں ہے اسکے رس بھی بہکانے کو
مکھّی کی طرح نہ اس میں دھنس کر گزرو

آداب گفتگو

وہ بات دہن سے نکلے جو بہتر ہو
مصری سے بھی جو مٹھاس میں بڑھ کر ہو
انکار کرو۔ مگر محبت کے ساتھ
الفاظ میں پنہاں نہ کوئی نشتر ہو

انسان کی تعریف

بے درد ہے گر کوئی تو حیوان ہے وہ
بے فیض اگر ہے تو بیاباں ہے وہ
یوں کہنے کو دنیا میں بہت ہیں انساں
انسان کے کام آئے جو انسان ہے وہ

انسان کی حالت

لڑواتا ہے گر کوئی تو لڑ جاتا ہے
کچھ سوچ کے پھر شرم سے گڑ جاتا ہے
مٹی کا کھلونا ہے یہ انساں محمودؔ
بنتا بھی ہے پھر بن کے بگڑ جاتا ہے

باطل کا مقابلہ کرو

بے وجہ کسی سے بھی نہ لو کچھ بھی ہو
غیبت نہ کسی کی بھی کرو کچھ بھی ہو
باطل کا مقابلہ کرو ہمت سے
سنجیدہ و خود دار رہو کچھ بھی ہو

پاکیزگیٔ نفس

اخلاق و وفا کا دل کو شیدا کر لو
سیرت میں کچھ اوصاف ہویدا کر لو
جو آگ سے جل سکے نہ پانی سے دُھلے
وہ نقشِ عمل نفس میں پیدا کر لو

حال پر نظر کرو

گزری ہوئی باتوں پہ عبث ہے بد دل
کیوں راہ میں اُلجھاتا ہے اپنی منزل
پامال ہو آئندہ غمِ حال سے کیوں؟
ماضی کی تلاش میں نہ کھو مستقبل

نیکی کر کے بھول جاؤ

جو کچھ بھی کوئی کہے اُسے کہنے دو
نیکی کا عوض ہی کیا ہے بس رہنے دو
اک فرض تھا جس کو تم نے انجام دیا
اب قلزمِ نسیاں میں اسے بہنے دو

قدرتی مناظر سے دلچسپی لو

گلزار میں بلبل کا چہکنا دیکھو
کہسار میں دریا کا چمکنا دیکھو
اور آب مصفا کے اس آئینہ میں
ہنستے ہوئے پھولوں کا لہکنا دیکھو

فطرت کے مطابق چلو

ہر رنگ سے ارتباط لازم ہے تمھیں
ہر حال میں انبساط لازم ہے تمھیں

ہے فرض حیات میں توازن محمود
غم ہو پھر بھی نشاط لازم ہے تمھیں

تقدیر و تدبیر

قسمت کا جو مفہوم سمجھ لے ناکام
کیوں ہو ہدف یاس و شکار آلام
تدبیر کا آغاز ہے انساں کے ہاتھ
تدبیر کے انجام کا قسمت ہے نام